
AFKAR
افکار
1/8/-
خاص نمبر



عدل و انصاف

* * میں اپنی رعایا کے جملہ افراد کو یقین * *
* * دلاتا ہوں کہ عدل و انصاف اور انکے جملہ * *
* * حقوق کی حفاظت کے لئے وہ سب ذات * *
* * پات اور امیری غریبی کی تفریق کے بغیر * *
* * میری نگاہ میں برابر ہیں - تمہارا سکھ * *
* * میرا سکھ اور تمہارا دکھ میرا دکھ ہے- * *
* * میں تمہاری سچی بھلائی کا خواہاں ہوں * *
* * اور تم سب کو خوش، فارغ البال اور تندرست * *
* * دیکھنا چاہتا ہوں۔

(تاجدار بھوپال)

- امن و اتحاد کی زندگی بسر کیجئے
- غریبوں کی خدمت کیجئے
- اپنی مادر وطن کی خوشحالی و ترقی میں کوشاں رہئے

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات عامہ بھوپال

(Adv.)



باپو زندہ ہیں !

''میں یا تو حالات کو سدھار دونگا یا انکی اصلاح کرتے ہوئے اپنی جان دیدونگا'' (گاندھی جی)

مہاتما گاندھی ہندو مسلم اتحادواتفاق کا وہ رشتہ پھر سے جوڑنے کے لئے کوشاں تھے جو ناسازگار حالات سے ٹوٹ گیا تھا' انھوں نے اپنی شہادت سے قبل مندرجہ بالا الفاظ کہے تھے'——ہمارا فرض ہے کہ آپس میں میل ملاپ کو ترقی دیں' بھائی چارہ بڑھائیں اور انکے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں.

اس طرح ہماري آزادي اور خوشحالی برقرار رہ سکتی ہے.

- بلا شبہ نیکیاں برائیوں کو دور کرتی ہیں
- عدم تشدد' صداقت اور محبت انسانیت کیلئے ضروري عناصر ہیں
- بدلہ لینے کا جزبہ سب سے بڑي لعنت ہے

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات عامہ بھوپال

(Adv.)



دائیں سے بائیں کرسیوں پر:- ابراہیم یوسف - محمد احمد سبزواری - رشدی - وجیہ الحسینی - محمد علی تاج - جان نثار اختر - صہبا
" " کھڑے ہوئے:- عمران الارشد - وحید چغتائی - اشتیاق عارف - اختر رومی - انجم سلمانی - عادل رشید



نربدا



مضافات بھوپال

ترتیب
رشدی - صہباؔ

افکار

خاص نمبر

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

(اقبالؒ)

قیمت:- ایک روپیہ آٹھ آنے
زرِ سالانہ:- چھ روپے



اشاریہ	ادارہ	۱
پیغامات		۲
اُردو کانفرنس، لکھنؤ	صہبا	۴

:آبگینے:

یہ فن کار	رشدی	۱۲
نئی غزلیں	حسرت موہانی	۱۳
جگر پارے	جگر مرادآبادی	۱۴
تلاش حیات	پروفیسر فراق گورکھپوری	۱۵
جشن آزادی	اسرار الحق مجاز	۱۶
کارل مارکس	جاں نثار اختر ایم اے	۱۷
وقت کی آوارگی	حامد عزیز مدنی	۱۸
پشیمانی	مسعود اختر جمال	۱۹
غزل	جعفر علیخاں اثر لکھنوی	۲۰
مکتی	احمد مجتبیٰ واحق	۲۱
مختصر افسانے	عبدالحمید عدم	
توّج	کمال احمد صدیقی	۲۲
قافلہ	شکر تونسوی	
پہلوئے اُٹھکر	مخمور جالندھری	۲۳

شراب خانہ	منظر سلیم	۲۴
وہ رات	پروفیسر احتشام حسین	
گیت	مقبول حسین احمد پوری بی اے۔ ایل ایل بی	۲۵
کل رات	غلام ربانی تاباں	
جواب دل	شاہد صدیقی	
شیش محل	اشعر ملیح آبادی	۲۶
آدھی رات کے بعد	میرا جی	۲۷
"ز" کے نام	عبادت بریلوی ایم اے۔	۲۸
ایورسٹ	اختر عرفانی بی اے۔	۲۹
ہولی	کنول پرشاد کنول	۳۰
رقص تصور	سلام مچھلی شہری	
التہاب نظر	صہبا	۳۱
دو غزلیں	سکندر علی وجد بی اے	۳۲
	شاعر لکھنوی	

:جائزے:

یہ فن کار	رشدی	۳۴
اُردو اور مشترکہ تہذیب	ڈاکٹر سید محمود (وزیر بہار)	۳۵
ترقی پسند ادب	قاضی عبدالغفار	۳۷
اُردو شاعری	پروفیسر فراق گورکھپوری	۴۱
اُردو کا مستقبل	نیاز فتحپوری	۴۲
کلچر اور فرقہ پرستی	ممتاز حسین ایم اے	۵۱
غزل کا ماضی، حال اور مستقبل	اختر انصاری ایم اے (شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)	۶۳
ہندی، ہندستانی	ڈاکٹر مسعود حسین خاں ایم اے، پی ایچ ڈی (شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)	۶۷
خاکے	احمد ندیم قاسمی بی اے۔	۷۱

:آبشار:

یہ فن کار	رشدی	۷۸
ماہر فن	کرشن چندر ایم اے۔	۷۹
یادونہ کرول جیں...	خواجہ احمد عباس	۸۵
آدم خور	ابراہیم جلیس بی اے۔	۹۳
عمل اور ردِّ عمل	صدیقہ بیگم سیوہاروی	۹۶
تاریکیاں	انور عظیم	۱۰۱
بھوپال کی صنعت و تجارت		۱۱۱
اشتہارات	مشتہرین حضرات	۱۱۳

:تصاویر:

ترقی پسند گروپ - نربدا - مضافات بھوپال - فلمی ستارے - دریائے نیل

جلد ۷　　　مارچ - اپریل ۱۹۴۸ء　　　شمارہ ۱ و ۲

اشاریہ

افکار کا پہلا خاص نمبر اپنی اچھوتی ترتیب و تدوین کے ساتھ حاضر ہے۔ اپنی دانست میں ہم نے اسے ہر لحاظ سے کامیاب ترین صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے لئے یہ اظہار ناگزیر ہے کہ وقت کی کمی، طباعتی مشکلات اور کاغذ کی نایابی نے ہمارے حوصلے پست کر دیئے اور ہم باوجود کوشش خاص نمبر کی ضخامت میں حسب خواہش اضافہ نہیں کر سکے۔ ہمیں اس کا بھی افسوس ہے کہ بیشتر فنکار اسی لئے شامل ہونے سے رہ گئے ——— تاہم خاص نمبر اچھا یا بُرا آپ کے سامنے ہے۔ اس پر ایک نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ آپ کے ذوقِ مطالعہ کی سیرابی کے لئے ہم کیا کچھ مہیا کر سکے ہیں۔؟

یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ خاص نمبر کی افادیت میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند اردو کانفرنس لکھنؤ کی تفصیلی روئداد نے نمایاں اضافہ کر دیا ہے۔ چنانچہ اس خاص نمبر کو آپ کانفرنس نمبر کی حیثیت دیکر اُردو زبان و ادب کی رفتار ترقی کا بآسانی جائزہ لے سکتے ہیں۔

اور یہ فنکار ——— ! جو اس خاص نمبر کی زینت بڑھا رہے ہیں ——— ہمارے شکریہ سے زیادہ آپ کے شکریہ اور قدر افزائی کے مستحق ہیں!

(ادارہ)

ضروری اعلان

خاص نمبر مارچ و اپریل ۱۹۴۹ء کی مشترکہ اشاعت ہے اور اب آئندہ شمارہ حسب معمول ماہ مئی میں شائع ہوگا۔ کاغذ کی ہوشربا گرانی اور نایابی کی بنا پر ہم افکار کے زر سالانہ میں خفیف سا اضافہ کرنے پر مجبور ہیں۔ یعنی اب سالانہ چندہ چھ روپے (۶ر) اور قیمت فی پرچہ نو (۹ر) آنے ہوگی۔

ہمیں امید ہے کہ قارئین ہمیشہ کی طرح افکار کی سرپرستی فرماتے رہیں گے اور اردو کے تحفظ کی خاطر اپنا مخلصانہ تعاون و اشتراک جاری رکھیں گے۔

خریدار صاحبان اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمائیں۔

(مہتمم اشاعت)

پیغامات

[انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کُل ہند اُردو کانفرنس لکھنؤ کو حسبِ ذیل پیغامات
برصول ہوئے تھے جو افتتاحی اجلاس منعقدہ ۲۹ دسمبر ۴۷ء میں سنائے گئے۔]

برلا ہاؤس۔ نئی دہلی۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۷ء

جناب عالی۔

آپ کا خط گاندھی جی کے نام کا ملا۔ وہ آجکل کسی اخبار کے نام یا کانفرنس وغیرہ میں عموماً پیام نہیں دیتے۔ اس لئے انھوں نے اُردو کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اُس کو ہی اُن کا پیغام تصور کیا جائے۔

آپ کا
برج کشور

Following from Pandit Jawaharlal Nehru.

21-12-47

BY TELEGRAM

Greetings and good wishes for success of your conference. Great opportunity for Progressive Writers. Espouse cause of true nationalism and brotherhood of man.

[بذریعہ تار ۲۱ دسمبر ۴۷ء]

"کانفرنس کی کامیابی کے لئے مبارکباد اور نیک تمنائیں قبول کیجئے، ترقی پسند مصنفین کے لئے زبردست مواقع ہیں۔ حقیقی نیشنلزم اور اخوت انسانی کے کاز کی حمایت کیجئے۔"

[جواہر لال نہرو]

وہ لوگ جو اپنے کو آزاد ہندوستان میں ترقی پسند ادیب کہتے ہیں ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ صحیح ادبی تخلیق میں پیش پیش رہیں گے۔ انھیں اپنے ادب کو پروپگنڈے سے ممیز کرنا ہے۔ انھیں صرف ایسے گنے چنے موضوعات میں اپنے آپ کو محصور نہیں کر لینا ہے جن سے کسی مخصوص سیاسی پالیسی کا پتہ چلے۔ زندگی لامحدود وسعتوں کی حامل ہے اور اسی لئے میں اس امر کی متوقع ہوں کہ انسانی مفاد کی تعبیرات میں کافی وسعت، ہمدردی اور زندگی کے بلا واسطہ مشاہدہ سے کام لیں۔ میں ابتدا ہی سے ترقی پسند مصنفین کی انجمن سے گہری دلچسپی لیتی ہوں اور آج میں ان نوجوان ادیبوں کی شہرت کا خاص خیال رکھتی ہوں جنھوں نے اس کی تنظیم میں حصہ لیا ہے، لیکن میں اس امر کی بھی متوقع ہوں کہ وہ ہندستان کی حقیقی آزادی میں اس آزادی کے مفہوم کو عام کرنے میں ایک گراں قدر حصہ لیں۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ کانفرنس کامیاب ہو اور اردو زبان میں حسین خیال اور گہرائی کا اضافہ ہو۔

سروجنی نائیڈو

۱۹، البرٹ روڈ، الٰہ آباد – ۱۶ دسمبر ۱۹۴۷ء

جناب بندہ

والانامہ مورخہ ۱۲ دسمبر صادر ہوا، میں یہ سنکر بہت خوش ہوا کہ آپ اُردو ادیبوں کی کانفرنس کر رہے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اپنے مقاصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ میں اُردو کو غیر زبان نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے کہ آسان اُردو ہر شخص سمجھنے کے قابل ہوتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اور کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں ۱۹ ماہ سے بعارضہ فالج بیمار ہوں۔ زیادہ نیاز۔

نیازمند

تیج بہادر سپرو

Senate House,
Allahabad.
16th Dec. 47.

I am glad that you are holding a conference of Urdu Writers in the last week of December and that you expect Maulana Abul Kalam Azad to preside over it.

I would have been happy to attend the conference but unfortunately it will not be possible for me to do so, as I have accepted engagement outside Allahabad.

I wish every success to your endeavours in solving the problems that face the Writers of Urdu.

Tara Chand.

[۱۶ دسمبر ۱۹۴۷ء

"مجھے خوشی ہے کہ آپ دسمبر ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتہ میں اُردو ادیبوں کی کانفرنس منعقد کر رہے ہیں، اور یہ کہ آپ کو توقع ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اس کی صدارت فرمائیں گے۔ مجھے کانفرنس میں شریک ہونے سے مسرت ہوتی لیکن بدقسمتی سے میں اس مسرت سے محروم رہوں گا کیونکہ میں اس دوران میں الٰہ آباد سے باہر مصروف رہوں گا، اُردو کے ادیبوں کو جن مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اُن کو حل کرنے کے لئے آپ کی جدوجہد کی کامیابی کا متمنی ہوں۔"

تارا چند]

Urdu is a gem of our common culture. Add lustre by making it more popular.

P. C. Joshi.
General Secretary,
Communist Party of India.

["اُردو ہمارے مشترکہ کلچر کا گوہرِ آبدار ہے، اسے اور زیادہ مقبولِ عام بنا کر دُرخشانی میں اضافہ کیجیے"

پی، سی، جوشی
جنرل سکریٹری کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا۔]

ہماری ادبی تحریک

اردو کانفرنس لکھنؤ

۱۹۳۶ء ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا تاریخی اور یادگار سال ہے۔ یہ سال وہ نشانِ راہ ہے جب ملک کے چوٹی کے فنکاروں نے انجمن کا منشور شائع کر کے عملی جدوجہد کا آغاز کیا۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک کو شروع کرنے والے وہ فنکار تھے جن کی نظر ادب اور زندگی کے وسیع، لامحدود اور بنیادی مسائل تک پہنچ چکی تھی —— وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ سرمایہ کی طرح ادب پر بھی رجعت پرستوں نے پہرے بٹھا دیے ہیں —— اور ان کی محفل میں نئے ادب کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ قدیم ادب کا یہ بوڑھا طبقہ اپنے رجعت فکر کو "قومی سرمایہ" سمجھ رہا تھا اور ترقی پسند فنکاروں کا گروہ تیزی سے جہل پرست طاقتوں کو شکست دینے کے لئے اپنی قوت کو جمع کر رہا تھا۔ چنانچہ تحریک کے آغاز کے کچھ عرصہ بعد تک قدیم اور جدید ادب کے پرستار اپنے اپنے مورچوں سے نبرد آزما رہے —— ترقی پسندوں نے ادب کو عوامی بنا کر زندگی کے اہم مسائل مثلاً بھوک، افلاس، معاشی پستی اور غلامی کے خلاف آواز اٹھائی —— انھوں نے ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین روایتوں کی وراثت کا دعویٰ کیا، غیر ممالک کے ترقی یافتہ رجحانات سے استفادہ کیا اور انھیں اپنے ملک کی آب و ہوا میں سمو کر پیش کیا —— انھوں نے واقعات و مشاہدات کے سطحی مظاہر سے گذر کر ان کی اندرونی کیفیت اور ماہیت دریافت کرنے اور اسے عام کرنے کی کوشش کی —— ہر اس جذبہ اور نظریہ کی ترجمانی اور حمایت کی جس سے نئے اردو ادب کو نئی اور بہتر زندگی کی تعمیر میں مدد ملی اور اس طرح ترقی پسندوں کے یہ تعمیری اقدامات ادب کا ارتقاء چاہنے والوں کو اپنے گروہ میں شامل کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ان کا قافلہ تقریباً دس سال کی مسافت کے بعد اپنی پہلی منزل تک پہنچ گیا اور جب حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا کل ہند اجتماع ہوا تو رجعت پرستوں کی ساری مخالفانہ سرگرمیاں سرد پڑ گئیں اور ہارے ہوئے جواری کی طرح انھیں اپنی بساط الٹنا پڑی —— جوان اور اصل طاقتیں اور تیزی سے آگے بڑھنے لگیں —— زندگی کی طرح ادب بھی ایک مرکز پر نہ ٹھہر سکا۔ نئی قدریں متعین ہوئیں۔ فکر و نظر کی راہیں کھل گئیں شعوری اور لاشعوری کیفیات سے ادب و زبان کو روشناس کیا گیا۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ زبان و ادب کے مردہ قالب میں نئی زندگی نیا جوش اور نیا خون پوری جولانی سے دوڑنے لگا —— اب ادب رجعت پسندوں کی اجارہ داری اور گھٹے ہوئے ماحول سے نکل کر عوامی رجحانات اور جدید تصورات کی وسیع پہنائیوں میں ارتقائی منزلیں طے کر رہا تھا —— ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک ترقی پسند فنکار مضبوط بنیادوں پر اپنی تحریک کو مسلسل آگے بڑھا رہے تھے ——————

—— ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہو گیا —— ترقی پسندوں نے اردگرد کی فضا کو دیکھا، اپنی تنظیم کا جائزہ لیا، مستقبل کے لئے نئے حالات کے مطابق پروگرام مرتب کیا اور آزادی کے بعد جن نئے مسائل، نئی ذمہ داریوں اور نئے حالات سے ملک کو دوچار ہونا پڑا تھا اور ملک کی تقسیم کے جن مہلک نتائج نے زبان، ادب، کلچر اور زندگی کے دوسرے مسائل پر فرقہ واریت نے اپنے مسموم اور تباہ کن اثرات ڈالنا شروع کر دیے تھے —— ان سب کو نظر میں رکھ کر انھوں نے زبان و ادب اور مشترکہ تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے لئے دوسرا کل ہند اجتماع اردو کانفرنس کی صورت میں کیا ——————

اردو کانفرنس کی تفصیلی کارروائی کی اشاعت کا خیال میں بھوپال سے لیکر لکھنؤ گیا تھا —— اور جب لکھنؤ سے لوٹا تو

خوش تھا کہ "نیا ادب" بمبئی کانفرنس نمبر پیش کریگا ـــــ لیکن چند در چند مجبوریوں کی بنا پر سردار جعفری مدیر "نیا ادب" نے میرا خیال مجھے لوٹا دیا ـــــ لیکن اُس وقت جب "افکار" کے خاص نمبر کا اعلان کیا جا چکا تھا ـــــ تاہم کانفرنس کے میٹر کی اشاعت کی ذمہ داری ایک خوشگوار فرض سمجھکر میں نے قبول کر لی اور سردار جعفری سے خواہش کی کہ کانفرنس کی رپورٹ وہ لکھ بھیجیں ـــــ لیکن پارٹی کے دوسرے اہم کاموں سے انھیں فرصت نہ مل سکی اور آخرکار یہ ذمہ داری بھی انھوں نے میرے سر ڈالدی۔ خاص نمبر کی مصروفیتوں کے باوجود اُردو کانفرنس لکھنؤ کی تفصیلی رپورٹ پیش کیجا رہی ہے۔ لیکن اس التماس کے ساتھ کہ چونکہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر کانفرنس کا مکمل ریکارڈ مجھے بروقت نہیں مل سکا اس لئے رپورٹ میں اگر کوئی کمی یا کوتاہی نظر آئے تو معاف فرمایا جائے۔

پروگرام

(۱)	۲۹ دسمبر ۴۷ء	۱۱½ بجے دن	ڈیلیگیٹس میٹنگ	صدر فراق گورکھپوری	گنگا پرشاد میموریل ہال
(۲)	"	۵½ بجے شام	افتتاحیہ جلسہ	" قاضی عبدالغفار	"
(۳)	"	۸½ بجے شب	مشاعرہ	" اثر لکھنوی	" (داخلہ بذریعہ ٹکٹ)
(۴)	۳۰ دسمبر ۴۷ء	۱۰ بجے دن	اجلاس نثر	" رشید احمد صدیقی	"
(۵)	"	۲½ بجے دن	اجلاس نظم	" فراق گورکھپوری	"
(۶)	"	۵½ بجے شام	قومی زبان کا مسئلہ	" نیاز فتحپوری	"
(۷)	"	۹.۳۰ بجے شب	مشاعرہ	(آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے براڈکاسٹ)	
(۸)	۳۱ دسمبر ۴۷ء	۱۱ بجے دن	ڈیلیگیٹس میٹنگ	صدر ڈاکٹر عبدالعلیم	ممتاز بلڈنگ
(۹)	"	۴ بجے شام	عصرانہ	منجانب مسز سروجنی نائیڈو گورنر یوپی	گورنمنٹ ہاؤس
(۱۰)	"	۶ بجے شام	مشاعرہ	صدر "	"
(۱۱)	"	۹½ بجے شب	کافی کی دعوت	منجانب مجلس استقبالیہ اُردو کانفرنس	کافی ہاؤس

صدر مجلس استقبالیہ :۔ آنند نرائن ملا۔　　سکریٹری مجلس استقبالیہ :۔ آل احمد سرور۔

نمائندے اور شرکاء

بمبئی :ـــــ سجاد ظہیر۔ علی سردار جعفری۔ ممتاز حسین۔ سلطانہ بیگم۔ ایم جاوید۔ حبیب تنویر۔

حیدرآباد :ـــــ اختر حسین۔ رضیہ بیگم۔ ریاست قائم علی۔ شاہد صدیقی۔ سلیمان اریب۔ تحسین سروری۔ سید عالم۔ لطیف الحسن برنی۔ ن۔م۔ صادق۔ ایوب۔

بھوپال :ـــــ شہبا لکھنوی۔ انجم سلمانی۔ عمران الارشد۔

فتح گڑھ :ـــــ غلام ربانی تاباں۔　　بنارس :ـــــ واثق احمد مجتبیٰ۔

گیا :ـــــ انور عظیم۔ بدیع مشہدی۔　　بدایوں :ـــــ مسعود علی ذوقی۔ کوکب جمیل۔

جھنگ گڑھ :ـــــ اقبال سہیل۔ یحییٰ اعظمی۔ ریاست علی۔

الہ آباد :ـــــ انیس الرحمٰن۔ فراق گورکھپوری۔ محمود ہنر۔

مرادآباد :ـــــ روش صدیقی۔　　ٹونک :ـــــ قمر ہاشمی　　آگرہ :ـــــ کمال احمد۔ مسعود شاہد۔ لطیف منظور۔

راولپنڈی :ـــــ جیون لال گوہر　　غازی پور :ـــــ علی عباس حسینی۔ حامد اللہ افسر میرٹھی۔

شاہجہاں پور :ـــــ ممتاز علی۔　　کاکوری :ـــــ اطہر صدیقی

جونپور :ـــــ شفیق جونپوری۔ ظفر صدیقی۔　　گورکھپور :ـــــ شمسی گورکھپوری۔

علیگڑھ :۔ رشید احمد صدیقی۔ اختر انصاری۔ ڈاکٹر مسعود حسین۔ اشعر ملیح آبادی۔ جذبی۔ فریدبخش قادری۔ خلیل الرحمٰن اعظمی

[illegible] ثمینہ تکمیل۔ [illegible] رضوی۔ مختار ارتب آرزو۔ انور انصاری۔ یوسف حسن۔

[illegible] محمد الدین [illegible]۔ حبیب احمد حمیدی [illegible]

کانپور۔ [illegible] مسعود اختر جمال۔ مجاز۔ ابوالخیر کشفی۔ محمد جمیل صدیقی۔ اسلم منیری

[illegible]

لکھنؤ۔ [illegible] عبد [illegible] نظر محمد [illegible] (انڈین ریڈیو)۔ نیاز فتحپوری۔ جگر مراد آبادی۔ ڈاکٹر رشید جہاں۔

کشن پرشاد کول۔ [illegible] لکھنوی۔ [illegible] حسین۔ ڈاکٹر عیم۔ حیات اللہ انصاری۔ نثار احمد شروانی۔ عبادت بریلوی

[illegible] سرور۔ حسن [illegible]۔ شوکت صدیقی۔ کمال احمد صدیقی۔ منظر سلیم۔ اعجاز [illegible] صدیقی۔ [illegible]

اختر زمانی۔ اصغر انصاری۔ شاعر لکھنوی۔ عابدی جعفری۔ فرقت لکھنوی۔ مکین حسن کلیم۔ حنیف نوق۔

اصغر حسین۔ محمد سلیمان صدیقی۔ منہاج الدین۔ محمد علی۔ [illegible] جعفر حسین۔ [illegible]۔ [illegible] لکھنوی

کامریڈ رشید۔ شورش صدیقی۔ [illegible]۔

ڈیلیگیٹس میٹنگ

پروگرام کے مطابق ۲۹ دسمبر کو وقت ۱۱ بجے دن گنگا پرشاد میموریل ہال میں ڈیلیگیٹس کی میٹنگ فراق گورکھپوری کی صدارت میں شروع ہوئی۔ آل احمد سرور نے کنوینر کی حیثیت سے کانفرنس کے مقاصد [illegible] پر روشنی ڈالی اس کے بعد [illegible] کانفرنس میں پیش ہونے والی تجاویز [illegible] [illegible] [illegible] ان تجاویز کے بعد [illegible] [illegible] [illegible] کمیونسٹوں [illegible] [illegible] کے مقاصد [illegible]

حیات اللہ انصاری کی یہ تجویز [illegible] [illegible] تقریر کرنے کی اجازت دی لیکن [illegible] میں سے کسی نے اس کی تائید نہیں کی۔ [illegible]

سردار جعفری نے [illegible] اس تجویز کے پس منظر پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے حیات اللہ [illegible] شہری [illegible] وغیرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ دراصل اس کانفرنس سے ان لوگوں کو کچھ شکایات پیدا ہو گئی تھیں جنھیں [illegible] دور کرنے کی کوشش کی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیات اللہ کی یہ تجویز [illegible] شکایات اور غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے۔ ترقی پسند تحریک کو چلانے میں غیر کمیونسٹوں کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے [illegible] [illegible]

نیا ادب کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے [illegible] کا ایسا پرچہ ہے جس کی [illegible] کمیونسٹوں [illegible] غیر کمیونسٹوں نے برابر کا حصہ لیا ہے۔ پچھلے کئی سال سے [illegible] [illegible] کی جا رہی ہے [illegible] نیا ادب [illegible] میں شامل ہو جائیں مگر انھوں نے [illegible] نہیں کیا۔ جعفری کی وضاحتی تقریر کے بعد حیات اللہ نے تجویز واپس لے لی۔

میٹنگ ختم ہونے سے قبل تمام نمائندوں کے [illegible] ووٹ [illegible] کئے گئے [illegible] نمائندوں کی [illegible] مختلف شہروں سے اس کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ میٹنگ ختم ہونے کے بعد تمام نمائندوں کو بیج تقسیم کئے گئے تاکہ وہ کانفرنس کی [illegible] میں بلا کسی روک ٹوک کے حصہ لے سکیں۔

پہلا اجلاس

اسی دن شام کو ۵ ½ بجے قاضی عبد الغفار کی صدارت میں اردو کانفرنس کا افتتاحی اجلاس [illegible] ڈاکٹر سید محمود [illegible] نے کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے اردو زبان کی ترقی پر ایک جامع تقریر فرمائی جس کا خلاصہ اگلے صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔ آپ کی تقریر کے بعد قاضی [illegible] نے خطبۂ صدارت پڑھا [illegible] خطبۂ [illegible] میں شامل ہے۔ خطبۂ صدارت کے دوران میں [illegible] ہال جو [illegible] مردوں سے بھرا ہوا تھا [illegible]

گونج اٹھی خطبۂ صدارت ختم ہونے پر سجاد ظہیر جنرل سکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین نے تحریک کی رپورٹ پیش کی، اور مقصد و حیثیت کے [illegible] تمہید کی پہلی کانفرنس سے اب تک کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ آپ نے اپنی تقریر میں کہا "ترقی پسند مصنفین ہمیشہ سے اتحاد کے لئے جد و جہد کرتے آئے ہیں۔ اُردو کو مسئلہ صرف فرقہ پرست ہندوؤں اور ہندی والوں سے ہی نہیں بلکہ اُردو والوں اور فرقہ پرست مسلمانوں سے بھی نقصان پہونچا ہے۔ زبان اور سیاست ایک دوسرے سے بے تعلق چیزیں نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ زبان [illegible] اس بڑے دعوے کا ایک جزو ہے جو زندگی کے دوسرے ترقی پسند شعبوں پر کیا جا رہا ہے۔ ہم نے ہندوؤں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ ہندی کی تکمیل اور سنسکرت سے بھی واقفیت حاصل کریں اس لئے کہ اُردو اور ہندی دونوں کو زندہ رہنے کا حق ہے اور دونوں کو زندہ رہنا چاہئے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہے کہ پاکستان کے ترقی پسند مصنفین زبان کو مقفل بنانے کی کوششوں کا مقابلہ کر رہے ہیں جن کا فیصلہ حال ہی کے ایک اجتماع میں کیا گیا ہے۔"

سجاد ظہیر نے آگے چل کر کہا "پہلی کانفرنس کی کامیابی نے ہمارے حوصلے بڑھا دیئے تھے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم یہ دوسرا کل ہند اجتماع منعقد کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ترقی پسند ہماری راہ میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اگر ہم اپنے ادب، اپنی زبان اور اپنے کلچر کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں تمام رجعت پسند طاقتوں کا پوری پامردی سے مقابلہ کرنا ہوگا۔" سجاد ظہیر کی تقریر کے بعد سکریٹری نے مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، شریمتی سروجنی نائیڈو، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر تارا چند اور پی سی جوشی کے وہ پیغامات سنائے جو اُردو کانفرنس کے لئے موصول ہوئے تھے ——

اور اس طرح پہلا اجلاس ۸ بجے شب کو ختم ہوا۔

مشاعرہ

چونکہ پہلے اجلاس نے زیادہ وقت لے لیا تھا اس لئے کانفرنس کا دوسرا اجلاس (مشاعرہ) مقررہ وقت پر شروع ہونے کے بجائے ۹ ½ بجے شب کو زیر صدارت جعفر علی خاں اثر لکھنوی شروع ہوا۔ مشاعرہ [illegible] اگرچہ لکھنؤ [illegible] گنگا پرشاد میموریل ہال و اس کے آس پاس سامعین کا اتنا بڑا اجتماع لکھنؤ کی تاریخ میں شاید پہلی بار ہوا تھا۔ مشاعرہ کے سکریٹری احتشام حسین تھے۔ [illegible] کی ترتیب میں کافی سلیقہ سے کام لیا گیا تھا۔ بالکنی میں صرف خواتین کی نشست کا انتظام تھا [illegible] چاروں طرف سامعین کا ہجوم مشاعرہ شروع ہونے کا بے چینی سے منتظر تھا —— احتشام حسین نے مائیکرو فون پر اعلان کیا ——

"—— حضرات اب مشاعرہ ہو رہا ہے ——" شعراء، سامعین، احتشام حسین کے اس اعلان کو [illegible] سارا ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ خاموشی ہوتے ہی احتشام حسین نے پھر کہا —— "حضرات اس مشاعرہ کی ترتیب میں ہم نے [illegible] تقدیم و تاخیر کا کوئی لحاظ نہیں رکھا ہے۔ دوسرے عام روایات سے ہٹ کر ہم اسے مزاحیہ کلام سے شروع کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے [illegible] آپ کو اپنا کلام سنائیں گے ——" [illegible] کے ظریفانہ کلام کے قہقہے ختم ہونے بھی نہ پائے تھے کہ فرقت لکھنوی آ گئے۔ اور ان کے بعد متعدد مزاحیہ شعراء نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ [illegible] سامعین کو بے قابو ہجوم ظریفانہ کلام پر سارے ہال کو زعفران زار بنا چکا تھا۔ اس سنجیدہ [illegible] چند [illegible] قہقہے لگتے رہے۔ [illegible] مشاعرہ جس میں تقریباً ۲۵ شعراء نے حصہ لیا تھا رات کے ۲ بجے اختتام پذیر ہوا۔

تیسرا اجلاس

۳۰ دسمبر کو زیر صدارت رشید احمد صدیقی اجلاس ٹھیک وقت ۱۰ بجے دن شروع ہوا۔ رشید احمد صدیقی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا —— "اُردو کے مستقبل سے ہمیں مایوس یا بددل نہ ہونا چاہئے۔ اُردو اس ملک کے رہنے والوں کا مزاج بن چکی ہے اور اس کو مٹانے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُردو کے لکھنے والے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور اُسی کو صحیح سمجھنے لگیں جسے حکومت صحیح سمجھتی یا کہتی ہے" —— "یہ کہنا غلط ہے ——" آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے واضح کیا —— "کہ اُردو کسی خاص فرقہ یا طبقہ کی ملکیت ہے۔ اگرچہ کوئی مخصوص گروہ اس کی اجارہ داری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان لوگوں کو جو [illegible] دوسروں کے کہنے میں آکر اس سے رشتہ توڑ رہے ہیں —— یاد رکھنا چاہئے کہ تاریخ ان کو [illegible] جن میں [illegible] ہندوستان [illegible] دوسرے ملک میں [illegible] صاف صاف الفاظ میں [illegible]

دوسروں کے کہنے میں آکر اس راستہ سے نہ ہٹ جائیں جو صحیح اور درست ہے —— اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی نے اردو کے مستقبل سے مایوس ہو جانے والوں سے ایک بار پھر اپیل کی کہ موجودہ حالات سے متاثر نہ ہوں، بلکہ اس کو ترقی دینے اور پروان چڑھانے کے لئے جدوجہد کرتے رہیں۔ آپ کی تقریر کے بعد ممتاز حسین نے "ادب اور فرقہ پرستی" خواجہ احمد فاروقی نے "آزاد کے خطوط" عبادت بریلوی نے "اردو کے متعلق ترقی پسندانہ نقطۂ نظر" اور گنگا دھر اگروال نے "پریم چند اور اُن کی زبان" پر مقالے سنائے جو اپنی افادیت اور جامعیت کے لحاظ سے کافی پسند کئے گئے۔ مقالوں کے دوران میں منہ کا مزہ بدلنے کے لئے سردار جعفری اور مجاز سے نظمیں سنی گئیں۔ یہ اجلاس تقریباً ۲ بجے دن کو ختم ہوا۔

چوتھا اجلاس

۲½ بجے دن سے کانفرنس کا چوتھا اجلاس بہ صدارت فراق گورکھپوری شروع ہوا۔ فراق گورکھپوری نے اردو زبان اور شاعری کی ہمہ گیری، اور دل موہ لینے والی خصوصیات پر بسیط روشنی ڈالی۔ ترقی پسند شاعری اور اردو زبان پر اظہار خیال کرتے ہوئے فراق نے کہا —— "ناگری رسم خط کو ہندوؤں سے نہیں ترک کرایا جا سکتا اس لئے اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی پڑھنے والوں میں اردو کی ترویج ہو تو ہمیں چاہئے کہ اردو شاعری کا اہم حصہ ہندی میں منتقل کر دیا جائے۔ یہ چیز بہت جلد کرنے کی ہے۔ ہمیں اردو والوں کی اردو دشمنی سے بھی آگاہ رہنا چاہئے۔ ہمارے یہاں غالب ذوق کے شعراء کا کلام بھی ناپید ہے۔ اردو ہماری ماں ہے، مر رہی ہے، ہمیں سچے اور صحیح ادب کی تعریف کرنا چاہئے" آگے چل کر آپ نے فرمایا —— "اردو کے شاعر کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ہندستان کی تہذیب صرف تین چار سو برس پرانی ہے۔ ہمیں ایسے شاعروں کی ضرورت ہے جو سنسکرت ادب، اس کی خصوصیات، اس کے مزاج، اس کی روح، اس کی گہرائی، اس کی بلندی اور اس کے شعور کی دور رس پہنچ میں۔ اردو شاعری زیادہ تر تعقلی رہی ہے۔ اردو شاعری میں ہندستان کا مزاج اس طرح لانا چاہئے جس طرح یہاں کے فنون لطیفہ، یہاں کی گھریلو زندگی سے متعلق جذبات میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں موجودہ زندگی کے مطالبات کو بھی نہ بھولنا چاہئے۔ لیکن جب تک آدرش میں بے کراں گہرائی نہ ہوگی، جب تک ہمارے دل پر خواب کا پرتو نہ ہوگا، اس وقت تک ہماری شاعری "منظوم اخبار نویسی" رہیگی —— مگر یہ دور جلد از جلد گذر جانا چاہئے۔ ترقی پسند شاعری آفاقی ہے، اب اس میں خوابناکی آنے لگی ہے۔ ہماری ترقی پسند شاعری اب وسیع تر فضا میں آگئی ہے۔"

صدارتی تقریر کے بعد مولانا حسرت موہانی نے اپنا کلام سنایا —— پھر خواجہ مسعود علی ذوقی نے "فانی کی المیہ شاعری کے عناصر" واثق احمد مجتبیٰ نے "ترقی پسند شاعری اور جدید فنی رجحانات" اور اختر انصاری نے "غزل کا ماضی، حال اور مستقبل" پر مخصوص مقالے پڑھے جنہیں عام طور پر پسند کیا گیا، چونکہ وقت زیادہ ہو چکا تھا اور سامعین دو شب کے مسلسل اجلاسوں کی وجہ سے کافی تھک چکے تھے۔ نیز آخری اور اہم اجلاس ۵½ بجے شام کو شروع ہونیوالا تھا۔ اس لئے یہ اجلاس تقریباً ۵ بجے ختم ہوا۔ ڈاکٹر مسعود حسین اور حنیف فوق کے مقالے —— "ہندی، ہندستانی" اور "ادب میں اظہار" وقت کی کمی کے باعث نہیں پڑھے جا سکے۔

پانچواں اجلاس

شام کو تقریباً ۶ بجے قومی زبان کے مسئلہ پر کانفرنس کا آخری اور سب سے اہم اجلاس زیر صدارت نیاز فتحپوری شروع ہوا۔ سامعین سے گنگا پرشاد میموریل ہال بھرا ہوا تھا۔ سب سے پہلے قاضی عبدالغفار نے صدر کا حاضرین سے تعارف کرایا۔ تعارف کے بعد نیاز فتحپوری نے اپنا مختصر اور جامع خطبۂ صدارت پڑھا (یہ خطبہ آپ آگے چل کر ملاحظہ فرمائیں گے۔) اس کے بعد آل احمد سرور نے تین تجاویز منجانب صدر پیش کیں۔ پہلی تجویز میں ملک کی آزادی پر اظہار مسرت کیا گیا تھا اور ان ادیبوں کی خدمات کو سراہا گیا تھا جنہوں نے آزادی کے حصول کے لئے جدوجہد کی تھی۔ ادیبوں اور مصنفوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ تہذیب اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو برقرار رکھنے میں کوشاں رہیں۔

دوسری تجویز میں فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہونے اور نقصان اٹھانے والے افراد سے اظہار ہمدردی کیا گیا تھا اور تیسری میں ہندستان اور پاکستان کے اُن علمی اداروں کے نقصانات پر اظہار افسوس کیا گیا تھا جو ان کو فسادات کے زمانہ میں اُٹھانے پڑے ہیں۔

اس کے بعد مولوی عبد الحق صاحب نے حسب ذیل اہم تجویز پیش کی —— کل ہند اردو کانفرنس کا یہ جلسہ اردو زبان کو ہندوستان کا ایک قیمتی تہذیبی سرمایہ تسلیم کرتا ہے۔ جو صدیوں کی بے فرقہ وارانہ تمدنی کوششوں کا حاصل ہے۔ اس جلسہ کی رائے میں یہ ملک کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور عرصہ سے عدالتوں، کچہریوں، دفتروں اور تعلیمی اداروں میں اردو رسم خط میں رائج اور مقبول رہی ہے یہ کسی ایک فرقہ کی زبان نہیں ہے۔ یہ اسی سرزمین میں پیدا ہوئی، یہیں پلی اور بڑھی، اور آج اس قابل ہے کہ ملک کی تمام علمی و ادبی ضرورتوں کی کفیل ہو سکتی ہے۔ ایک ایسی زبان کو اس کی موجودہ حیثیت سے گرانا اس کے بیشتر سرمایہ کو بدیسی قرار دینا اور سرکاری ملازمتوں امتحانوں اور دوسرے ذمہ دار شعبوں میں صرف ہندی جاننے کو کافی سمجھنا جیسا کہ یو پی، بہار اور سی پی کی حکومتوں اور پبلک سروس کمیشن یو پی اور سی پی کے تعلیمی بورڈ اور دوسرے اداروں کی روش سے ظاہر ہے کسی طرح صحیح اور قرین انصاف نہیں۔ یہ اقدام غیر جمہوری اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے منافی ہے۔ اس جلسہ کی رائے میں اردو کی حمایت اور ان حملوں کی مدافعت جو اس قومی و تہذیبی میراث پر مختلف حلقوں سے ہو رہے ہیں ہمارا قومی، تہذیبی اور ادبی فرض ہے۔ نیز اردو کے سرمایہ پر فخر کرنا جو ہندوستان کے رنگا رنگ کلچر کی سب سے بڑی اور بیش بہا دولت ہے اور جو ہماری باہمی یک جہتی اور تہذیبی اشتراک کا نشان ہے، درحقیقت ہر محب وطن کے لئے ضروری ہے۔
یہ جلسہ اردو کے تمام ہمدردوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے ممکن کوشش کریں اور اسے بڑھانے اور پھیلانے کے لئے ہر وقت سرگرم رہیں ——— تجویز پیش کرتے ہوئے مولوی عبد الحق صاحب نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا —— "ہم تقسیم کے نتائج دیکھ رہے ہیں، اسے ہم نے قبول نہیں کیا بلکہ ہم مجبوراً اس پر راضی ہوئے لیکن آج بھی کوئی ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور مشترکہ زبان کو تقسیم نہیں کر سکتا۔ یہ ہیجانی کیفیت زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہ سکتی اور زبان اور تہذیب کو تقسیم کرنے کی کوشش کرنے والے جلد ہی محسوس کریں گے کہ وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس ملک میں عصبیت، جوش اور جذبات کو دخل نہ دینا چاہئے بلکہ افادیت کو مد نظر رکھنا چاہئے۔ زبانیں حکومت اور اقتدار کی قوت سے نہیں بنا کرتیں بلکہ عوام کے بولنے سے بنتی ہیں۔ جو زبان عوام کی زبان ہوتی ہے وہ اس کی بقا اور اس کے ترقی کی ہوتی ہے۔ اگر حکومت کا واقعی یہ منشاء ہے کہ عوام میں کسی زبان کو قومی بنائے تو اسے چاہئے کہ وہ چند ماہرین کے ذریعہ وہی لغات مرتب کرے جسے عوام واقعی بولتے ہیں ورنہ صحیح طور پر قومی زبان نہیں بن سکتی۔"

پنڈت کشن پرشاد کول نے تجویز کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ [illegible] کشمیری پنڈتوں نے بھی اردو کو مادری زبان [illegible] حکومت کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ گاندھی جی کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ہندوستانی کو ملک کی عام زبان بنائے [illegible] ہندی زبان کو رائج کرنا غلط ہوگا۔ [illegible] یہ بھی غلط ہے۔ [illegible] گاؤں میں جا کر [illegible] سرکاری حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا تو ہم اس مسئلہ کو [illegible] مولانا حسرت موہانی کی تقریر سے اس اجلاس میں کافی گرمی اور [illegible] "اردو ایک خالص ہندوستانی زبان ہے اس لئے اردو اس کی مستحق ہے کہ اسے وہی حیثیت [illegible] ہمارا ایمان ہے کہ اس وقت اردو کو جو [illegible] ——— اردو کے مستقبل کے مایوس ہو [illegible] شکست خوردگی کی کوئی وجہ نہیں [illegible] ایک ایسی فضا پیدا کرنی چاہئے کہ [illegible] اس مسئلہ کے کئی پہلو ہیں۔ [illegible] جیسے کہ قدیم تہذیب گزر گئے

ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سجاد ظہیر نے تقریر کی۔ انھوں نے کہا "ہمارا مقصد ہندی کی مخالفت کرنا نہیں بلکہ ہم اردو کی وہ حیثیت باقی رکھنا چاہتے ہیں جس کی وہ مستحق ہے۔ جو لوگ ہندی اور اردو والوں میں تفریق اور مخالفت پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ ہمارے دشمن ہیں۔ ہندی والے اگر اردو اور اردو والے اگر ہندی نہیں پڑھیں گے تو ان کی زبانیں تشنہ رہیں گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ دونوں زبانیں ترقی کریں اور ایسی مشترک زبان بن سکے جو قومی زبان ہو سکے۔" — قاضی عبد الغفار نے بحث کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اردو زبان ہمارے مشترکہ تمدن کی ایک علامت ہے اور اگر ہم اپنا مشترکہ سرمایہ محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو اردو کو بھی محفوظ رکھنا چاہئے۔ چونکہ اس بحث نے کافی وقت لے لیا تھا اور مقررین پوری شدت سے اردو اور ہندی پر اظہار خیال کرتے کرتے شدید جذبات کی رو میں بہے جا رہے تھے اس لئے بحث کو ختم کرتے ہوئے صاحب صدر نے اسی مسئلہ سے متعلق ایک قرارداد [illegible] پیش کرنے کی اجازت دی ——— "انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند اردو کانفرنس کا یہ جلسہ ہندی کے ترقی پسند ادیبوں کی اس تحریک کا خیر مقدم کرتا ہے جو انھوں نے قومی زبان کے مسئلہ پر الہ آباد کی کانفرنس میں منظور کی اور جس کی رو سے اس مسئلہ پر اردو کے ادیبوں سے بات چیت کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ یہ جلسہ ضروری سمجھتا ہے کہ اس مسئلہ کے بارے میں ہندی اور اردو کے ادیب مل کر غور کریں اور ایک مشترکہ حل تجویز کریں۔ یہ جلسہ ہندی کے ادیبوں سے گفت و شنید کرنے کے لئے مندرجہ ذیل اصحاب کی کمیٹی تجویز کرتا ہے۔ اس کمیٹی کو اپنی تعداد میں اضافہ کرنے کا اختیار ہوگا:۔ قاضی عبد الغفار، رشید احمد صدیقی، نیاز فتحپوری، فراق گورکھپوری، راجندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر عبد العلیم اور [illegible] (کنوینر)۔ ڈاکٹر علیم نے قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا "فرقہ وارانہ سیاست کا یہ اثر ہے کہ ہم آج اس کے نتائج بھگت رہے ہیں۔" حسرت موہانی کی تائید کرتے ہوئے [illegible] انھوں نے وضاحت کی "جس انداز سے مولانا نے تقریر کی ہے اس سے ترقی پسندوں کو بہت بڑا خطرہ پیدا [illegible] ہے۔ لیکن شکوک و شبہات کو دور کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایک دوسرے میں غلط فہمی پیدا کی جائے۔ ہم ہندی کے ادیبوں سے جو گفت و شنید کر رہے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اردو کو چھوڑ رہے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپس میں مل کر قومی زبان کا فیصلہ کریں گے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ متحد ہو جائیں اور پھر اس کے بعد ہم مشترکہ پلیٹ فارم سے یہ آواز بلند کریں کہ ہندی بھی رہے اور اردو بھی رہے"۔ اس قرارداد کی تائید حامد اللہ افسر نے کی اور بعد ووٹ کثرت رائے سے منظور ہو گئی۔

حیات اللہ انصاری نے بھی ایک تجویز پیش کی جس میں کانگرس کو وہ فیصلہ یاد دلایا گیا تھا جس کی رو سے اس نے ہندوستانی کو ہندوستان کی زبان قرار دیا تھا۔ اس سلسلے میں آپ نے اظہار خیال فرماتے ہوئے کہا کہ ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ کانگرس آج اپنے فیصلے سے [illegible] ہے۔ اس تجویز کی مخالفت میں سردار جعفری نے تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اس پلیٹ فارم سے ——— ایسی تجویز پاس نہیں کرنا چاہئے جس کا تعلق سیاست سے ہو۔ ہم سیاسی پلیٹ فارم سے اس نوع کی تجویز ضرور پیش کر سکتے ہیں [illegible] نہیں۔ حیات اللہ صاحب اس قرارداد کو واپس لے لیں تو مناسب ہے۔ چنانچہ حیات اللہ انصاری نے [illegible] واپس لے لی۔ آخر میں میرے توجہ دلانے پر [illegible] احمد سرور نے [illegible] کے اس اعلان کو جلسے میں پڑھ کر سنایا جس [illegible] انجمن ترقی پسند مصنفین ہند کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ اعلان چونکہ ایک تجویز کی صورت میں تھا [illegible] نے متفقہ طور پر اس کی توثیق کی۔ اس کے بعد کانفرنس کی کارروائی نہایت کامیابی کے ساتھ تقریباً [illegible] بجے رات کو ختم ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی اور لکھنؤ یونیورسٹی کے طلباء نے کانفرنس کے رضاکاروں کی حیثیت سے نہایت محنت اور جانفشانی سے کام کیا اور [illegible] کانفرنس کو ہر لحاظ سے کامیاب بنایا۔

مشاعرہ

ٹھیک ۹ بجے [illegible] ریڈیو لکھنؤ سے مشاعرہ براڈکاسٹ ہوا۔ اس مشاعرہ میں باوجود کوشش ریڈیو کے ارباب حل و عقد زیادہ وقت دینے اور شعراء کی تعداد بڑھانے پر رضامند نہیں ہوئے۔ جس کی وجہ سے [illegible] حصہ نہ لے سکے۔

[illegible]

[illegible]

(باقی صفحہ ۱۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

فن کار
نئی غزلیں
جگر پارے
نقش حیات
جشن آزادی
کارل مارکس
وقت کی آوارگی
پشیمانی
غزل
مکتی
مختصر افسانے
توبہ
تنقید
پہلو سے اُٹھ کر

خراب خانہ
وہ رات
گیت
کل رات
جوابِ دل
شیش محل
آدھی رات کے بعد
... کے نام
ایورسٹ
ہولی
رقص تصور
التہاب نظر
دو غزلیں

آبگینے

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے!

یہ فنکار

حسرت موہانی — شاعر پہلے ہیں، لیڈر بعد میں ہیں۔ ہر شعر میں جذباتیت غالب ہے۔ اُردو شاعری کے ستونوں میں شمار ہوتا ہے۔ سیاسی حسرت ابھی پوری نہیں ہوئی۔ سنا ہے پاکستان کو ایک سوشلسٹ، ری پبلک اسٹیٹ بنانے کی فکر میں ہیں ——— "ایک حسرت تعمیر تھی سو ہے" ——— !

جگر — اپنے رنگ کے اعتبار سے جگر ہی ہیں۔ ان کے اشعار "شعلہ طور" سے کم نہیں۔ کہتے ہیں "جگر کو شراب نے مارا" لیکن اب "حلقۂ پاک بازاں" میں شامل ہو گئے ہیں۔ اخبار نویسوں نے انھیں کئی بار موت کے حوالہ کر دیا۔ مگر مراد آباد سے وہ ہر بار ایک نئے انداز سے اُٹھے۔

مجاز — حقیقت بن کر چمکا اور "ستاروں کی گردش تیز ہے ساقی" کے تصور سے "آتش سیال" میں جذب ہو کر رہ گیا، شاید کبھی "غم دل" سے ہوش میں آ سکے۔

جاں نثار اختر — ان کے اک جاں نثار ہم بھی ہیں!

حامد عزیز — نچوڑے کے رسیلے سنگترے یاد آنے لگتے ہیں۔ آجکل وسط ہند کے دار الحکومت میں براجمان ہے ——— ترقی پسند شعراء میں ممتاز درجہ حاصل ہے۔

اثر لکھنوی — نواب جعفر علی خاں اثر۔ شاعر بھی ہیں اور ناقد بھی۔ لکھنوی تہذیب و شرافت کا نمونہ ہیں۔ اپنا کلام سنانے میں پوری فیاضی سے کام لیتے ہیں۔

وامق جونپوری — عجب بات ہے۔ واشنگٹن کے محکمہ میں ہے اور "بھوکا ہے بنگال" سنا تھی۔ لیکن انسانیت کا المیہ بھی پڑھ دیا! اب مہاتما گاندھی پر سوگوار ہے۔ لیکن ہزار ہا نوحہ خواں اور قصیدہ گو بنکر ——— "دلی کا سیہ کاروان ہے"۔

کمال احمد — جس کی شاعری کمال پر پہونچتی جا رہی ہے۔ صلاحیتیں ابھر رہی ہیں۔ "ہمارا ادب" اس کی مردانہ کاوشوں کا عکس ہے۔

فکر تونسوی — مخمور جالندھری — یہ دونوں فنکار جالندھر سے ادب کی جدید قدروں کی "رفتار" بڑھانے میں منہمک ہیں۔ مخمور نے بڑی جدت طراز طبیعت پائی ہے۔

منظر سلیم — یہ نوجوان فنکار تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور ترقی پسند شعراء میں نمایاں جگہ حاصل کر لی ہے۔

احتشام حسین — ترقی پسند ناقد ہیں۔ مگر نقد و نظر کی خیوں سے اکتا کر "رومان کی آغوش" میں پناہ لی ہے۔ "غم جاناں" کی تڑپ اشعار میں ابھر آئی ہے۔

مقبول حسین — یہ شباب بھوپال میں گذرا۔ رسیلے اور رہ مزگیت کس قدر مقبول ہیں۔

اشعر ملیح آبادی — ملیح آبادی آموں کی طرح شیریں، اور رسیلے شاعر، خاموش اور معصوم فطرت۔ علیگڈھ کی درسگاہ میں مصروف تعلیم اور علالت کا شکار رہا۔

میرا جی — رات بھگال کی گرد میں اُلجھا ہوا، جنگ سے بے خبر ہے۔ گھونگھٹ ٹوٹ چکا لیکن وہ ابھی تک میں زندگی کا کھیل کھیلا جا رہا ہے ——— !

عیش دت — بانی نظر نقاد و شاعر، نئے رنگ میں جلوہ گر ہو رہا ہے۔

اختر عرفانی — زندگی کے بوجھ تلے دبا ہوا، زندگی کی ان گنت منزلیں طے کئے جا رہا ہے۔ خلوص و محبت کا بندہ ہے۔ اس کی نظر لندن اور پیرس کی چوٹی پر ہے۔

کنول پرشاد — کنول کتنا روپ ہے ——— ہولی ——— اور خونی ———!

صہبا — مجسم "ذکار" حساس شاعر "غم دوراں" کے ساتھ "غم جاناں" بھی سینہ سے لگائے ہوئے ہیں ——— کاش "لکھنؤ" اور "بھوپال" کے دلوں کی دھڑکنیں ایک ہو جاتیں!

سکندر علی وجد — نئے اسلوب اور نئی ہیئت کا مالک ہے۔ ان دنوں جالنہ (حیدرآباد) کے "ایوان نعمانی" میں متمکن ہے ——— !

رشدی

نئی غزلیں

(۱)

پاس تو رہتے ہیں مگر دور ہیں — کھل کے وہ ملتے نہیں مجبور ہیں
طعنِ عزیزاں کا نہ ہو خوف اگر — میرے لئے اب بھی وہ رنجور ہیں
جان کے معذورِ تغافل انھیں — شوق کے سب طور بدستور ہیں
پردۂ انکار میں، اقرار کے — کتنے ہی پہلو ہیں جو مستور ہیں
حسرتؔ ان آنکھوں کی ولا ہے شفا
حسن کے بیمار جو مشہور ہیں

(۲)

دل اُن سے مِل کے اب اُن کو بھلا نہیں سکتا
مگر یہ کیوں ہے میں خود بھی بتا نہیں سکتا

بقدرِ حوصلۂ عاشقی ہے شوق وصال
مگر وہ شوق جو دل میں سما نہیں سکتا

یہ کس کے عجزِ تمنا کا پاس ہے کہ وہ شوخ
بزعمِ ناز بھی دامن چھڑا نہیں سکتا

تری نظر کا ہے ناوک وہ ناوکِ دل دوز
نشانہ کوئی بھی جس کا بچا نہیں سکتا

انھیں یقینِ محبت نہیں، غضب تو یہ ہے
کہ چیر کر میں دل اپنا دکھا نہیں سکتا

اگرچہ میں ہمہ تن درد ہوں مگر حسرتؔ
کوئی جو پوچھے، کہاں ہے؟ بتا نہیں سکتا

(اردو کانفرنس۔ لکھنؤ)

حسرت موہانی

غزل

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آجکل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آجکل

سازِ حیات سازِ شکستہ ہے ان دنوں
بزمِ خیال جنتِ ویراں ہے آجکل

آنکھیں تمام مشہدِ عشق و جمال ہیں
سینہ تمام گنجِ شہیداں ہے آجکل

دل کی جراحتوں سے کھِلے ہیں چمن چمن
اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آجکل

انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی
انساں کے سائے سے بھی گریزاں ہے آجکل

وہ قومیت کہ جس سے ہو انسانیت ذلیل
ہندوستاں میں کس قدر ارزاں ہے آجکل

وہ دن گئے کہ طائرِ مقصود تھا شکار
انسان کا شکار خود انساں ہے آجکل

ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہے ان دنوں
ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آجکل

کیسا خلوص، کس کی محبت، کہاں کا درد
خود زندگی متاعِ گریزاں ہے آجکل

کچھ رہبرانِ ملک جو مخلص ہیں واقعی
اُن کا چراغ بھی تہِ داماں ہے آجکل

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگر
جو مصلحت کہ پیشۂ مرداں ہے آجکل

(اُردو کانفرنس، لکھنؤ)

جگر مرادآبادی

تلاشِ حیات

[illegible] کا ساتھ چلو — [illegible] بڑھے چلو
نغمہ بلب بڑھے چلو — [illegible] سے چلو
[illegible] — جو بھی پڑے سہے چلو
ہوش نہیں تو غم نہیں — جھومتے جھامتے چلو
کون و مکاں کی سرحدیں — توڑتے تاڑتے چلو
اٹھ چلو آندھیوں کی طرح — سیل نما بڑھے چلو
جیب سکون و صبر کو — پھاڑتے چلو سیے چلو
پھول نہیں تو داغوں سے — دامنِ دل بھرے چلو
موت جو آئے راہ میں — موت کو بھی [illegible] چلو
[illegible] — خاک بھی چھانتے چلو
راہِ وفا کے ذروں کو — اذنِ حیات دیے چلو
ہاں یوں ہی [illegible] — موت کو تو [illegible] چلو
سوکھی ہیں زیست کی [illegible] — خون سے سینچتے چلو
[illegible] مراد کو [illegible] — آبِ حیات دیے چلو
اپنے ہی دل کی آگ میں — اور بھی [illegible] چلو
چاند سے کیف و مستیٔ — رات ہے [illegible] چلو
[illegible] — [illegible] سے [illegible] چلو
[illegible] سے ٹھنڈی [illegible] — آنچ سی کچھ دیے چلو
بڑھے چلو بڑھے چلو — بڑھے چلو بڑھے چلو

حیات ڈھونڈتے چلو
حیات ڈھونڈتے چلو

یمن یمن عدن عدن — کلی کلی چمن چمن
بنا لیے ہوئے [illegible] — [illegible]
بہ سوزِ عشق [illegible] — بہ [illegible] حسن [illegible] بدن
جوانیوں کی آگ میں — محبتوں کے راگ میں
[illegible] اور [illegible] میں — حسینوں کے سہاگ میں
دھواں دھواں گھٹاؤں میں — ستاروں کی سبھاؤں میں
اندھیری [illegible] میں — [illegible] ان بلاؤں میں
رسیلی نرم اداؤں میں — جھکی نظر کی چھاؤں میں

حیات ڈھونڈتے چلو
حیات ڈھونڈتے چلو

بہ [illegible] و بہ کیف و غم — بہ ہر نشاط و ہر الم
جہاں جہاں عدم عدم — جدا جدا بہم بہم
ارم ارم حرم حرم — خدا خدا صنم صنم
صدائے [illegible] میں — سکوت خاک و سنگ میں
جہانِ [illegible] رنگ میں — امنگ میں ترنگ میں
چھلکنے والے زہر اور چڑھنے والی لہر میں
ہر ایک جبر اور ڈھائے جانے والے قہر میں

حیات ڈھونڈتے چلو
حیات ڈھونڈتے چلو

افق افق جبینوں میں — [illegible] سینوں میں
ہوا کے نرم لوچ میں — [illegible] سوچ میں
شفق کے [illegible] میں — سحر کے [illegible] میں
صبا کے گدگدانے میں — کلی کے مسکرانے میں
حیا کے رنگ لانے میں — [illegible] میں
فلک کے [illegible] میں — قیامتیں اٹھانے میں
فضا کے سنسنانے میں — [illegible] کے [illegible] میں
سیہ پوش راتوں میں — [illegible] کی گہری [illegible] میں

حیات ڈھونڈتے چلو
حیات ڈھونڈتے چلو

شفق شفق جمال میں — [illegible] میں
فراق میں وصال میں — [illegible] وصال میں
جہاں [illegible] میں — [illegible] اور [illegible] میں
[illegible] کی نرم سانس میں — [illegible] کی [illegible] پیاس میں
ہر ایک لالہ زار میں — ہر ایک دشت خار میں
[illegible] شرار میں — [illegible] میں
ادائے شرمسار میں — نگاہ بے قرار میں
بہ خلوت و بہ جلوہ گہ — بہ ہر ادا بہ ہر [illegible]
[illegible] بار گہ — بہ ہر [illegible] و ہر [illegible]
[illegible] میں ثواب میں [illegible] میں
غمِ فراقِ یار اور [illegible] میں
جنوں میں اور ہوش میں خزاں میں اور بہار میں
چڑھاؤ میں اتار میں نشے میں اور خمار میں

حیات ڈھونڈتے چلو
حیات ڈھونڈتے چلو

بہ فکر نفع و زیاں — بہ [illegible] رائگاں
یہ ارض اور یہ آسماں — زمان [illegible] مکاں
جو ہر عیاں ہے ہر نہاں — یقیں یقیں گماں گماں
مثالِ برق ہے اماں — یہاں [illegible] وہاں
نگاہ [illegible] میں — حقیقت و مجاز میں
ہر ایک [illegible] ہوشیاری میں — فراق [illegible] میں

حیات ڈھونڈتے چلو
حیات ڈھونڈتے چلو

فراق گورکھپوری

([illegible] کانفرنس لکھنؤ)

جشنِ آزادی

بہ صد غرور، بہ صد فخر و نازِ آزادی　　مچل کے کھل گئی زلفِ درازِ آزادی
مہ و نجوم ہیں نغمہ طرازِ آزادی　　وطن نے چھیڑا ہے اس طرح سازِ آزادی
زمانہ رقص میں ہے زندگی غزلخواں ہے

ہر اک جبیں پہ ہے اک موجِ نورِ آزادی　　ہر ایک آنکھ میں کیف و سرورِ آزادی
غلامی خاک بسر ہے حضورِ آزادی　　ہر ایک قصر ہے اک بامِ طورِ آزادی
ہر ایک بام پہ اک پرچمِ زر افشاں ہے

ہر ایک سمت نگارانِ یاسمیں پیکر　　نکل پڑے ہیں در و بام سے مہ و اختر
وہ سیلِ نور ہے، خیرہ ہر آدمی کی نظر　　بہ صد غرور و ادا خندہ زن ہے گردوں پر
زمینِ ہند کہ جولانگہِ غزالاں ہے

صدا دو انجمِ افلاک رقص فرمائیں　　بتانِ کافر و سفاک رقص فرمائیں
شریکِ حلقۂ ادراک رقص فرمائیں　　طرب کا وقت ہے بیباک رقص فرمائیں
اب ایسے میں کہ تقاضائے بزمِ رنداں ہے

ہے پاک ابرِ غلامی سے آسمانِ وطن　　یہ کام کر گئے آخر بلاکشانِ وطن
ابھی تو خیر سے وہ چند ہو گی شانِ وطن　　ابھی تو اور بھی مہکے گا بوستانِ وطن
کہ یہ بہار، پیامی صد بہاراں ہے

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں　　یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں
وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں　　ابھی وہ سعیِ جنوں خیز کامیاب نہیں
یہ انتہا نہیں - آغازِ کارِ مرداں ہے

اسرار الحق مجاز

کارل مارکس

مل سکا صدیوں نہ عالم کی حقیقت کا سراغ
نقشِ ہستی کو تو سمجھا گیا تصویرِ آب
تفسیرِ عالم کسی کے نزدیک تخمینہ ہوا
ایک کے نزدیک دنیا پہ عنصر کا وجود
ایک نے تقسیم کی ذروں میں اشیا کی نشست
ایک کی ظلمت نظر جب پہنچیں نگاہیں دور تک

فکر کے جلتے رہے بجھتے رہے لاکھوں چراغ
جستجو کے دشت میں پہلے قدم پر تھا سراب
آگ سے دنیا بنی کوئی یا آتش ہوا
سارا عالم خاک و باد و آب و آتش کی ہے نمود
ذہن سے تخلیق کی در پردہ روحِ کائنات
دیکھ لی ہر شے کے آئینہ میں جوہر کی جھلک

ایک کو صورت اک دوری احوال کا —
ایک کے نزدیک ہر شے روح کا ادراک ہے
ایک نظاروں نے گو کھینچی ہیں اشیا و خود وجود
ایک نے ذہن کیا نفسی حقیقت کا چراغ
ایک نے قائم کیا مطلق ارادہ کا وجود —

یعنی یہ عالم ہے پرتو عالمِ امثال کا
روحِ لامحدود ہی ذاتِ الٰہ پاک ہے
اصل میں ہر شے کی ذہنی جوہروں سے ہے نمود
ذرہ ذرہ میں تصور ذرہ ذرہ میں دماغ
خارجی اظہار جس کا یہ جہانِ ہست و بود

پھر نتیجہ علم نے اُلٹی جو ظلمت کا نقاب
مل گیا ان جوہروں میں برقپاروں کا نشاں
نظریۂ عالم کے بنے وہ جامد و محکم اصول
زندگی فولاد کے سانچے میں ڈھل کر رہ گئی

تجربہ کی روشنی میں بڑھ گئی جوہر کی آب
مادہ نے روح پر چھپ کر گرائیں بجلیاں
ہو گئے "اصلی تغیر" کی تمنا میں فضول
ذہنِ انساں کی خود دنیا بدل کر رہ گئی

ایک نے تنقیدیت کا پھر دیا عالی پیام
پھر سے حکمت کے شبستانوں میں اک نیا خون
دہر میں ہونے لگی نشو و نما کا ایک عمل

فہم جس کا ذہن میں تو کر گیا تازہ نظام
بے سکے مطلق کی خیالی داستاں
پھر بھی کچھ باریک نکتے کر گیا باتوں میں حل

روز آخر ہو وہ محشر بدوش سینے کا راز
وہ مفکر، وہ حکیمِ نکتہ سنج و نکتہ داں!
آئینہ اُس چشم پر تہذیب کے اسرار بھی
حفظ اُس کو ارتقائے زندگی کی داستاں
شعلۂ حکمت سے عالم تاب تھا جس کا دماغ
اک ہمہ پہلو ہم آہنگی کا تب یہ جہاں
ارتقا جدلیاتی سلسلے کا نام ہے!
ذرہ ذرہ میں ہے پنہاں دو ضدوں کا اتحاد
ذرہ ذرہ میں مسلسل ہیئت و ماہیت کی جنگ
اک طرف ہر شے کے باطن میں کشاکش کا وجود
نقشِ نو میں عکس اک مٹتی ہوئی تصویر کا —
کیت و کم کی بھی تغیر کا جو راز ہے
ارتقا کے فیض کی کل زندگی ممنون ہے

خود ہے ہم آہنگیٔ فکر و عمل کو بس پہ ناز
آشکارا جس پہ فطرت کا ہر اک رازِ نہاں
منکشف اُس ذہن پر تاریخ کی رفتار بھی
ہر تغیر کی حکایت، ہر تبدل کا بیاں
اُس کے ہاتھوں سے ہوا روشن حقیقت کا چراغ
ارتقا کے راستے پر اک نظام کا زوال
زندگی کی جاوداں امید صبح و شام ہے
جس سے ہر شے میں ہے پیدا زندگانی کا جہاد
ارتقا کا اک تقاضہ زندگی کی اک امنگ
اک طرف اشیا میں خود ربط و تقابل کی نمود
ہر نئی شے میں کسی بھی راز ہے تغیر کا
زندگی میں انقلابوں کا یہی انداز ہے
دہر کی تاریخ کا خود بھی یہی قانون ہے

رازِ ہستی عقدۂ ارتقا، سرِّ حیات
مل گیا انساں کو تاریخ کا رازِ دوام —
فکرِ انساں کو عطا کی اُس نے رفتارِ جدید
زندگی کو اُس نے بخشا اک نیا جامع نصاب

ذہنِ آدم پر ہوئے طالع رموزِ کائنات
اقتصادی زندگی کی معتبر شرحِ دوام
ہو گئی گمراہ کی خواہش میں منزل کی امید
"نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب"

---

* اس لفظ کو کبھی ... کے وزن پر استعمال کیا گیا ہے۔
(انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال میں پڑھی گئی)

جاں نثار اختر

وقت کی آوارگی

بھٹکتے قہقہوں میں شوخ قندیلوں کے جھرمٹ میں
وہ آوارہ نفس بادہ کشوں نے جام چھلکائے

حسینوں کے پیاسے نیند سی بوجھل پپوٹوں نے
گناہِ آدم و حوا کے بجھتے خواب دہکائے

رگ و پے میں وہ دوڑیں بجلیوں کی نرم زنجیریں
تبسم نے رگِ جاں تک وہ اپنے دام پھیلائے

سکوتِ نیم شب سے ہی چمک اٹھا تھا درد اپنا
ہوا کے نرم جولاں سرد جھونکے چار اور آئے

کلیساؤں کے سوتے ارغنوں نے کروٹیں بدلیں
وہ سالِ نو کے کھلتے پرچموں کی جھوم اٹھے سائے

بجھانے کتنے نادیدہ چراغ ایوانِ فردا کے
خیال و خواب کی ڈھلکی ہوئی ظلمت نے چمکائے

خداؤں کی نگاہوں دیوتاؤں کی جبینوں پر
اُٹھے وہ وقت کے آتے ہوئے آثار بل کھائے

وہ بڑھ کر اوٹ میں لی کال نے کھیتوں کی ہریالی
کہ خونِ گرم دہقاں گردشِ عالم سے دب جائے

وہ زنگ آلود پہیوں کی قطاریں رقص میں آئیں
شکستہ بازوئے مزدور کو زنجیر پہنائے

وہ خونِ ابنِ مریم جگمگا اٹھا صلیبوں پر!
وہ زہر آلودہ بوسے دوستی کے رنگ لے آئے

وہ آئینِ جہاں پرور کے کتنے تار ٹوٹے اور سست
حکومت کے مشیرِ خاص کی آنکھوں میں لہرائے

دھوئیں کے شوخ مرغولوں میں ہی شہروں کی آبادی
زمیں پر آسمانوں کے اندھیرے آج اتر آئے

وہ بے تعبیر خوابوں کی لرزتی دھند میں آخر
ہزاروں راہرو اک اجنبی آہٹ نے بہکائے

وہ کتنا وقت آہوئے رمیدہ کی طرح بھاگا
سکونِ شب شاید موت کی وادی میں یہ پائے

زمیں نے جاگتے سوتے ہوئے انگڑائیاں لے کر
فسانے وقت کی آوارگی کے آج دہرائے

حامد عزیز مدنی

پشیمانی

سرد ہے دل کی فضا۔ ذہن پہ طاری ہے جمود
چشمکِ برق و شرر۔۔ اب نہیں پیمانوں میں!
دعوتِ فکر و سخن۔ اب نہیں میخانوں میں
وہ گدازِ دل و جاں۔ شمع کی فطرت میں نہیں
عشق کا سوزِ یقیں۔ اب نہیں پروانوں میں
لے اُڑی اہلِ جنوں کو ہوسِ نام و نمود
سرد ہے دل کی فضا۔ ذہن پہ طاری ہے جمود

سطوتِ بزمِ جہاں کس کو دکھاؤں آخر
ہم نفس کون ہے؟ پیغامِ سحر دوں کس کو
راہبر کوئی نہیں۔ اذنِ سفر دوں کس کو
رہ گئے دشت و جبل۔ گردِ جنوں بیٹھ گئی
کارواں گم ہوا۔ منزل کی خبر دوں کس کو
مژدۂ فتحِ بلطف کس کو سناؤں آخر
سطوتِ بزمِ جہاں کس کو دکھاؤں آخر

کیسا طوفان تھا۔ اک موج نہ ساحل سے اٹھی
عرصۂ زیست بھی اک شعلۂ برہم تھا مگر
پیکرِ ظلم تو نشترِ مجسم تھا مگر
رہزنِ ہوش تھی یہ جنگ و جدل کی دنیا
محوِ نظارہ بھی اک سانحۂ غم تھا مگر
آہ بھی لب پہ نہ آئی۔ نہ فغاں دل سے اٹھی
کیسا طوفان تھا۔ اک موج نہ ساحل سے اٹھی

برق سے خوف نہ صیاد سے شکوہ ہے مجھے
اپنی ہی آگ سے جلتا ہے نشیمن اپنا
اپنی ہی آنچ سے لو دیتا ہے گلشن اپنا
اپنے قدموں ہی سے پامال ہے گھر اپنا جمال
اپنے ہاتھوں ہی سے اب چاک ہے دامن اپنا
اپنے ذوقِ ستم ایجاد سے شکوہ ہے مجھے
برق سے خوف نہ صیاد سے شکوہ ہے مجھے

آج میں اپنے ہنر سے ہوں پشیمان اے دوست
دور یہ بے ہنری کا ہے یہ اندازِ ہنر
نہ وہ دل ہے۔ نہ وہ دنیا ہے۔ نہ وہ فکر و نظر
کیا سناؤں گا زمانے کی خبر میں تجھ کو
سچ تو یہ ہے مجھے ملتی نہیں اپنی بھی خبر
تیری محفل میں ہوں۔ بادیدۂ گریاں اے دوست
آج میں اپنے ہنر سے ہوں پشیمان اے دوست

(اردو کانفرنس لکھنؤ)	مسعود اختر جمال

غزل

بہار ہے ترے عارض سے لَو لگائے ہوئے
چراغ لالہ و گل کے ہیں جھلملائے ہوئے

ترا خیال بھی تیری ہی طرح آتا ہے
ہزار چشمِ [illegible] چھپائے ہوئے

لہو کو پگھلی ہوئی آگ کیا بنا [illegible]
جو نغمے آنچ میں دل کی نہیں تپائے ہوئے

سحر نے کھول دیئے اپنے شبنمی بازو
چمن میں پھول ہیں پائل ترے کھلائے ہوئے

قدیم سے ہے یہی رسم و راہِ مُلکِ وفا
وہ آزمائے گئے جو تھے آزمائے ہوئے

ڈھٹائی دیکھی، تجھی سے لڑاتے ہیں آنکھیں
ستارے آنکھوں کی تیری جھپک چرائے ہوئے

جو منتظر تھے کسی کے وہ سو گئے آخر
سسکتی آرزؤں کو گلے لگائے ہوئے

اب اس کے بعد گلہ کس سے کیجئے کس کا؟
سمجھتے تھے جنھیں اپنا وہی پرائے ہوئے

ہم اپنے حالِ پریشاں پہ مسکرائے تھے
زمانہ ہو گیا یوں بھی تو مسکرائے ہوئے

وہی ہیں میرے شبستانِ شعر کی زینت
جو خواب حسن و محبت کے ہیں دکھائے ہوئے

اثرؔ سناتی ہیں اب دل کی دھڑکنیں شب کو
فسانے اُس نگہِ مست کے سنائے ہوئے

(اُردو کانفرنس۔ لکھنؤ)

اثرؔ لکھنوی

مُکتی

جواب اس کا کون دے
کسے اب اتنا ہوش ہے
کہ آج ہند کس کے سوگ میں سیاہ پوش ہے
یہ کس کا خون بہہ گیا
یہ کون جاتے جاتے دل کا راز سب سے کہہ گیا
یہ کون قتل ہو گیا
فسانۂ حیات کون کہتے کہتے سو گیا ———

جواب اس کا کون دے
کہ خود ہمارے ہاتھ اس لہو میں ہیں رنگے ہوئے

وہ زندگی کا رازداں
وہ بے کسوں کا پاسباں
وطن کا میر کارواں
نظر سے دور ہو گیا

وہ جام جو چھلک رہا تھا
حریت کے بادہ میں ویرسے مہک رہا تھا
چور چور ہو گیا ———
نظر سے دور ہو گیا

وہ بوڑھا جسم! ہڈیوں کا ایک کانپتا بدن!!
مگر رگوں میں اس قدر جواں لہو تھا موجزن
کہ جس کی بوند بوند میں بسی تھی الفتِ وطن
لہو وہ آج بہہ گیا۔
وہ بوڑھا جسم مر گیا
مگر وہ کام کر گیا ———
جسے وہ جیتے جی نہ اپنے آپ پورا کر سکا
تمام عمر جس میں امن و آشتی دبا گیا ———
تمام عمر جو اسی امید میں جیا کیا ———
کہ ایک دن ضرور سارے تفرقے مٹائے گا ———
فساد کا یہ کھوکھلا طلسم ٹوٹ جائے گا ———

وہی بزرگ خانداں
وہی ہمارا پاسباں
ہمی سے آج چھٹ گیا
سہاگ مادرِ وطن کا اپنے ہاتھوں لٹ گیا

سپہرِ ہند کی اندھیری رات کا وہ ماہتاب
قریبِ صبح پارۂ شفق میں منہ لپیٹ کر
لہو بھرے کفن میں اپنی [illegible]
نظر سے دور ہو گیا۔

مہیں کہیں غروب ہو کے بدلیوں میں کھو گیا
ستارے ماند پڑ گئے
ذرا جو تیز گھومتے وہ بدلیوں سے لڑ گئے
جمے ہوئے ہزاروں برس کے سخت برف کے ڈھیر
پگھل کے نرم ہو گئے
ہوا کے سرد جھونکے رفتہ رفتہ گرم ہو گئے
وہ چاند جو غروب ہو گیا تھا بن کے آفتاب
دلوں کو کرنی شعاعِ زندگی میں گوندھتا
بلند ہوتا جا رہا ہے مشرقی فضاؤں میں
پھر اتحاد کے پھریرے کھل گئے ہواؤں میں
غلط کہ میر کارواں
غلط کہ اپنا پاسباں
نظر سے دور ہو گیا
نظر سے دور ہوتے ہی دلوں میں کھنچ کے آ گیا
ہماری روح کے شکستہ تاروں کو ملا گیا
وہ خون وہ رفیق سے
سر دو زندگی کی سے
وہ ضربِ تیشۂ حسیں
نگاہ زندگی کو اس قدر حسیں بنا گیا ———
کہ موت کا سیاہ دیو
اپنی نکبتوں کے بوجھ ہی میں دب کے رہ گیا
سیاہ دل میں جس قدر سفید خون تھا بہہ گیا
اداس ہو رہے تھے جو دماغ جگمگا گئے ———
ہمارا نوجوان قافلہ پھر اٹھ کھڑا ہوا ———
جھپٹی ہوئی قطار کہنہ سے لڑا ہوا
دو دارا رختہ ہو کے تازہ دم
[illegible] بہم بہم
شعاعِ زندگی کی جلو میں چل کھڑا ہوا۔
نقیبِ وقت سے کہو
کہ [illegible] نعرے پھر لگائے
[illegible] سے ہٹ گئے ہیں ان کو راہ پھر دکھائے
جہاں تک یہاں تک
کہ کوئی باقی رہ نہ جائے
دلوں میں جن کے چور ہیں وہ اس کو خوب جان لیں
[illegible] آئے گی
گھٹا نہ دل پہ چھائے گی
[illegible] کرن کرن نکھر سکے
[illegible] تھے جگمگا اٹھے
[illegible] غروب ہو گیا تھا بن کے آفتاب
دلوں کو اک نئی شعاعِ زندگی میں گوندھتا
بلند ہوتا جا رہا ہے مشرقی فضاؤں میں

وامق احمد مجتبیٰ

مختصر افسانے

تموّج

اِک موج مچل جائے تو طوفاں بن جائے
اک پھول اگر چاہے گلستاں بن جائے
اک خون کے قطرہ میں ہے تاثیر اتنی
اک قوم کی تاریخ کا عنواں بن جائے

راہ میں سنگِ میل کے نزدیک
اک مسافر ملول بیٹھا ہے
یا سفر کی تھکان کافی ہے!
یا خلافِ اصول بیٹھا ہے

شکن نہ ڈال جبیں پر شراب دیتے ہوئے
یہ مسکراتی ہوئی چیز، مسکرا کے پلا
سرور، چیز کی مقدار پر نہیں موقوف
شراب کم ہے تو ساقی نظر ملا کے پلا

کون ہے جس نے مے نہیں چکھی
کون جھوٹی قسم اٹھاتا ہے!
میکدہ سے جو بچ نکلتا ہے!
تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے

عبدالحمید عدم

مری کھڑکی کے شیشہ پر
ابھی تک آخری شبنم کا قطرہ تھرتھراتا ہے
—— اسی شبنم کا قطرہ —— جس نے کلیوں کو نمو بخشی
فضائے انجم و مہتاب کی جس میں صباحت ہے
وہی شبنم کا قطرہ تھرتھراتا ہے مری کھڑکی کے شیشے پر!

ستارے ڈوبتے ہی چاندنی بھی ہوگئی مدھم
مگر وہ ایک تارہ اپنی تنہائی سے بے پرواشمالی وادیوں پہ ٹمٹماتا ہے!
وجودِ رہبرِ اعظم بھی اتنا کسمپرسی ہے
ندیم شب نے جسکو سمِ قاتل جان کر بھی پی لیا اور خودکشی کرلی!!

شبِ مہتاب کی آنکھوں کا اشکِ آخری شاید وہی تنہا ستارہ ہے!
مری کھڑکی کے شیشہ پر جو شبنم بن کے اب بھی تھرتھراتا ہے!

حقیقت کیا ہے یوں تو ایک آنسو کی
مگر سورج کی جب بھی کرن اس سے گذرتی ہے
تو رنگوں میں سنورتی ہے
دھنک بن کر نکھرتی ہے

حقیقت کیا ہے یوں تو سرد اور بے رنگ آنسو کی
کہ جو قوسِ قزح کے رنگ سورج کی کرن کے کچھ عناصر ہیں!!

وہ مشرق کے افق پر سرخ لہریں تھرتھراتی ہیں
انھیں میں خونِ ماہ و زہرہ و پروین بھی شامل ہے۔!!!

کمال احمد صدیقی

قافلہ

کہاں چلے ہو دوستو!
لہو لہو نگاہ میں تبسم نہاں لئے ہوئے
چھلکتے آنسوؤں میں درد بیکراں لئے ہوئے
سوال پہ ایک تشنگی کہ جیسے کوئی آ کے جوئبار سے پلٹ چلے
کہ جیسے اک ستارہ ٹوٹ کر فضائے تیرگی میں ڈوب جائے۔
کہ جیسے ایک گیت چیخ بن کے تھرتھرائے۔
میں سوچتا ہوں اگر امنگ بن کے سینۂ زمیں پہ کیوں رہے؟
اگر رہے تو پھوٹ کر شگفتہ پھول کیوں بنے؟
اگر بنے تو کیوں نہ دست گلفروش کی لپک جھپٹ سے بچ سکے؟
—— گلو گرفتہ گلو —— فسردگی کے سورماؤ! کہاں چلے؟
اٹھا کے زرد لاش اپنے نغمۂ حسنِ شوق کی۔
سنبھال کر دلوں میں بے بسی کی چند دھڑکنیں
نکل کے اپنی وادیوں سے ڈھونڈتے ہوئے بہار بے ثمر کو
بچھڑ کے اپنے گیت سے، فلک سے اپنے ٹوٹ کر
طلسم دست گلفروش کے اثر سے بے خبر
کہاں چلے ہو دوستو!

—— (۲) ——

کہاں رکوگے دوستو!
افق کی اس لکیر پر ——؟
سنا رہی ہے آسماں کو جو زمیں کی داستاں
کہ ہم نے کیسے اپنی بے بسی کے راز بیچ کر
بنا دیا تھا چند تاجروں کو پاسبان [illegible]۔
لڑے تھے ہم، بہے تھے ہم، بہی تھیں خون کی ندیاں
مگر جب ایک دن کہ اپنے گیت جا رہے تھے چیختے ہوئے
اٹھے اور ہم نے اپنے راز بے بسی کو پا لیا
بڑھے اور اپنی کھیتیوں کے وادیوں کے راستے کو جا لیا۔
بچھڑ کے ملے افق کی لالہ گوں لکیر پر ——
وہاں جہاں پہ زندگی ہے آپ اپنی دھڑکنوں کی پاسباں
وہاں جہاں پہ دست گلفروش بھی روا نہیں۔
جہاں بہار بے نشاں نہیں، روش روش پہ گلفشانی ہے بے خطر
طلسم ہائے رنگ و بو کے اثر سے بے خبر
—— وہاں رکوگے دوستو!؟
—— وہاں رکوگے دوستو!!

فکر تونسوی

پہلو سے اٹھ کر

بیٹھے ہیں جو تن نہ پہنچی تکلف کی حدود
اک بستر کے ذرا پھیلتے ہی ٹوٹ گئیں
سر بسر ایک امنگ خوابیدہ رگ و پے میں شراب
اک نظر کیف بسی سے کاغذی پھولوں کی بہار
کاغذی پھول لگا ہونے کو لی ہیں
دوسری آنکھ کسوٹی کے کمالات لئے
جس سے پرکھے گئے رنگ، جسم، خدوخال، ابھار
اک جھجک اور بندھی بیرانی اور ساتھ کی امید
بندھی امید ذرا اور کبھی زیبت سمٹی۔
چاندنی رات کا جھٹکا ہوا چاند بولا
"سوچتے کیا ہو گوارا ہے گوارا کر لو"
فربہ اندام بھری جیب نے سرگوشی کی
"مسکرا اب چھوڑ دو پندار میں آ کر روحن کو
آج کی رات تہی دست ہی گھر جاؤ گی؟"

ادھر ارماں کہ ضرورت سے زیادہ مل جائے
ادھر امید کسی بات پہ انکار نہ ہو
چاہیے اصرار تعین سے تجاوز کر جائیں
زلفیں کھل جائیں بکھر جائیں ذرا شانوں پر
زلفیں کھل جاتی ہیں شانوں پہ بکھر جاتی ہیں
نرم مرمر سی حقیقت پہ سے پردے اٹھ جائیں
پردے اٹھ جاتے ہیں تابندگی بڑھ جاتی ہے
یہ سکڑنے کی سمٹنے کی بناوٹ چھوڑو
زیر ہونے کا جو خدشہ ہے تلاطم بن جاؤ
چند ہلکوروں میں ساحل پہ سفینہ ہوگا

چند ہلکوروں میں ساحل پہ سفینہ پہنچا
چیخ اٹھا ماہ جبیں رات کا اترا چہرہ
"سوچتی کیا ہو اٹھو کوئی بہانہ کر کے
اکتفا کر لو زیادہ کی توقع چھوڑو
جیسوا ہی تو نہیں ماں بھی ہو دو بچوں کی
خوف اٹھتی ہوئی تنہائی میں ڈرتے ہوں گے
جانا تم ان کے لئے ہی یہ ستم سہتی ہو
لیکن اک روز ہمارا بھی تو وہ دیں گے تھیں!"

اور پھر ڈھلتی ہوئی رات کے جوبن نے کہا
"اٹھو وہ دیکھ رہی ہوگی تمہاری بیوی
آج تنخواہ کا دن ہے وہ ابھی جاگتی ہے
اس کے آویزے اب اس ماہ تو بننے سے رہے
ڈھونڈتے میں بہانہ بھی تو کرنا ہے تلاش!"
اٹھے پہلو سے تو دونوں ہی فسردہ اٹھے!

مخمور جالندھری

شراب خانہ

(۱)

شراب خانہ میں بیٹھا ہوں سوچنے کے لئے
نہ جانے کتنے خیالوں کا رازداں بن کر
نہ جانے کتنی حدوں سے گذرتا جاتا ہوں

مگر حدوں سے گزر کر فریب کھاتا ہوں
کہ یہ حدیں تو پھر آجائیں گی کہیں نہ کہیں
نظر کی راہ میں دیوارِ آسماں بن کر

فریب کھانا بڑی بات تو نہیں لیکن۔۔
یہ چند لمحوں کی دیوانگی ہی کیا کم ہے
یہ چند لمحے جو آتے ہیں میہماں بن کر

(۲)

شراب خانے میں بیٹھا ہوں سوچنے کے لئے
نہ جانے کتنے خیالوں کا رازداں بن کر
نہ جانے کتنے خیالوں سے پوچھتا ہوں میں

یہ درد کیسا ہے یوں جس میں مبتلا ہوں میں
یہ کیسا غم ہے جو دل کو جلائے جاتا ہے
کبھی شرارِ جہنم، کبھی دھواں بن کر؟

نہ جانے شام و سحر کے نگار خانے سے
یہ تیر کون مری سمت پھینک دیتا ہے
مرے تڑپتے ہوئے دل کا پاسباں بن کر؟

(۳)

مگر خیال کہاں بولتے ہیں ایسے میں
کہاں سے آئیگی آواز کون بولے گا؟
بغیر جانے ہوئے راز کون کھولے گا؟

یہ چند لمحے جو آتے ہیں میہماں بن کر
کہیں یہ روٹھ نہ جائیں کہ میں اکیلا ہوں
ہر ایک لمحہ کی آمد پہ اُٹھ نہ پاؤں گا۔

شراب ختم ہوئی جارہی ہے رات آئی
زمانے بھر کی نگاہوں کا بار اُٹھائے ہوئے
یہاں سے اُٹھ کے کہاں اور کیسے جاؤں گا؟

منظر سلیم

وہ رات

آج بھی تم کو کیا وہ بات ہے یاد؟
مست و سرخوش مری جوانی تھی
شاد و شاداب تھا تھا رات شباب
روح کو ایسی شادمانی تھی
ضو فشاں سیکڑوں بہت روں کی
پاس مہتاب کے تھا یوں ہر دل

دل پہ نقش ہے وہ بات ہے یاد
ہر گھڑی عمر کی سہانی تھی
ہر ادا سے برس رہی تھی شراب
خود محبت سے بدگمانی تھی
چاند نکلا جھرمٹ میں تاروں کی
جیسے رادھا کے دوش پر آنچل

تھی فضا دل میں نغمہ ریز ہوا
گیت سا مجھ کو اک سنایا تھا
کیا ترنم تھا کیا روانی تھی
بس نغمہ میں کھو گیا تھا جہاں
آج ہو تم وہی، وہی میں ہوں
یوں بجھے سے ہیں ولولے دل کے

ایسے میں تم نے بھی بہ پاس وفا
میرے ساز طرب پہ گایا تھا
جیسے ہر چشمہ پر جوانی تھی
لے کے دامن میں سو گیا تھا جہاں
دل پہ طاری نہیں مگر وہ جنوں
جیسے گہنا گئے ہوں ارمان سے

زندگی پھر نہ مسکرائے گی!
کیا وہی رات پھر نہ آئے گی؟
مسکراؤ اسی طرح اک بار
اور گاؤ اسی طرح اک بار!

سید احتشام حسین

گیت

جا! تجھ کو رخصت کرتا ہوں اے میرے متوالے گیت!
کوئی تجھ کو پیار کرے گا
کوئی نکتہ چینی
پائیگا کوئی فیض سے تیرے
دل خوش کن رنگینی
کسی کے دل میں پیدا ہوگی پیاری سی غمگینی
جو دل بھی دمساز ہو تیرا بنے تو لینا اس کو جیت!
جا! تجھ کو رخصت کرتا ہوں اے میرے متوالے گیت!
دار فنا کی اس محفل میں
عیش ہے غم کا بہانا
جو نے بھید دلی انتا ہے
اسی میں گھل مل جانا
دل کی راہ جو دل سے تکتی ہے اسی پہ بکو لگانا
تھا سہارا لیکر شاید دکھ کی گھڑیاں جائیں بیت!
جا! تجھ کو رخصت کرتا ہوں!

مقبول حسین احمد پوری

کل رات

مرا تصور رسا قیا شراب پی بہک گیا
افق کی چھاؤں میں ہزار تارے ناچنے لگے
بجھا بجھا شباب کا چراغ بھر بھڑک اٹھا
رگوں میں خون کے عوض شرارے ناچنے لگے
مری فسردہ آرزو کو اک سہارا مل گیا
نگاہوں میں جیسے ماہپارے ناچنے لگے
خیال بال زن ہوا کسی کی بزم کی طرف
نظر میں رنگ و چنگ کے نظارے ناچنے لگے
وہ زور تھا وہ شور تھا تلاطم حیات کا
کہ ذکر موج و بحر کیا کنارے ناچنے لگے

غلام ربانی تاباں

جوابِ دل

یہ لطفِ کشاکش کیا کم ہے، سامانِ سکوں حاصل نہ سہی
کشتی کا کوئی وارث تو ملا، طوفاں ہی سہی ساحل نہ سہی

ماضی کی فسردہ یادوں سے جی خوش نہ کریں مستقبل کا
محفل تو سجانی لازم ہے، وہ پہلی سی محفل نہ سہی

رکتے ہی فنا ہو جائیں گے، دم لیتے ہی کھو جائیں گے
ہم لطفِ سفر کے خوگر ہیں، رہبر نہ سہی منزل نہ سہی

کلیوں کا تبسم بھی ہے وہی، بوندوں کا ترنم بھی ہے وہی
دنیا کے تقاضے باقی ہیں، وہ ہم نہ سہی وہ دل نہ سہی

گلشن کی مسلسل بربادی ہم سے تو نہیں دیکھی جاتی
ہر پھول سے دل کو نسبت ہے ہر پھول جوابِ دل نہ سہی

(اردو کانفرنس۔ لکھنؤ)

شاہد صدیقی

شیش محل

میری دنیا جیسے کنول　کتنی سہانی، کتنی سجل　تو بھی جلا دے دنیا کو　آگ میں اپنی خود ہی جل
مدھ ماتی آنکھیں، کومل　جیسے دو جھیلیں جل تھل　دیکھو دیکھو ٹوٹ نہ جائے　آشاؤں کا شیش محل
کون اشارہ کرتا ہے؟　دور وہ اک بجتی چھاگل　ہاں کوئی سہانا گیت سناؤ　آج فضائیں ہیں بوجھل
نرم ادائیں، لو دیتی　جیسے ستاروں کے آنچل　آج تو تم آغوش میں ہو　کتنی جھجکتی تھی پہلے پہل
صاف دمکتے سینے پر　سوئے ہوئے دو مست کنول　رات میں جیسے میٹھا خواب　یوں تری آنکھوں میں کاجل
حسن مجھے بھی اپنا لے!　بچ کر نہ میری راہ سے چل　میں بھی غمگیں تم بھی اداس　اور ملے کیا عشق کا پھل!
کہنے کی سب باتیں ہیں　بات بنی ہے آج نہ کل　ایک ہی دھارا، ایک ہی راہ　کوثر و زمزم۔ گنگا جل

تیرا شعر غمگیں ہے
کیسی نظمیں؟ کیسی غزل؟

(اردو کانفرنس۔ لکھنؤ)

اشعر ملیح آبادی

آدھی رات کے بعد

کھلونے بکھرے ہوئے پڑے ہیں،
نہ اب وہ جھنکار ہے، نہ ڈالی ہوا کے جھونکوں سے جھومتی ہے۔
نہ اب کوئی پیڑ جاگتا ہے — یہ شور، ہنگامہ ہاؤ ہو کا یونہی مچلتا رہے ہمیشہ
یونہی اُبلتا رہے ہمیشہ یہ شب کا چشمہ،
مگر وہ چشمہ جو چند لمحوں میں ایک دریائے بیکراں بن کے پھیلتے پھیلتے ہر اک شے پہ چھا گیا تھا،
اب ایک گہرے سکوں میں گم ہے!
کھلونے بکھرے ہوئے پڑے ہیں —....
یہ سرد احساس ایک افسردہ گونج بن کر بتا رہا ہے۔
نہ اب وہ جھنکار ہے، نہ دامن کا شوخ پردہ
جو اپنی لہروں کے جھلملاتے ہوئے فسوں میں چھپا رہا تھا
کہ ڈال کیسے ہوا کے جھونکوں سے جھومتی ہے
چلے گئے شب کے گانے والے
چلے گئے اپنے سازِ غم سے مری مسرت بڑھانے والے،
سنو:- بہت خوب، واہ وا، کیا نرت ہے، کیا بھاؤ ہیں، یہ باتیں،
سنو:- یہ گت خوب تھی، یہ ناچ ایسے تھا کہ جیسے پہاڑی ندی
اچھلتی جاتی ہے، سنگریزوں کو اپنے پہلو میں لے کے رستے کے پتھروں سے
تھپیڑے کھاتی ہے! خوب تھا، واہ وا— یہ باتیں،
اور آنکھیں بوجھل تھیں، نیند گمبھیر تان بن کر بلا رہی تھی،
زباں پہ کہتی تھیں، ہاں ابھی سوتے ہیں ابھی سوتے ہیں، ذرا ایک گیت سن لیں،
سفر کی لذت بڑھانے والا
تھکے ہوؤں کو اُٹھانے والا ابھی ذرا ایک گیت سن لیں،
ابھی چھکتے، لپکتے دامن کی شوخ لہروں کو تھام لیں گے!
مگر وہ ناچ اک اچھوتی عورت کی پہلی چاہت کا عکس بن کر اُبلتا چشمہ بنا ہوا تھا؛
تھکے ہوئے فرش پر سکوں ہے
ستون چپ ہو رہے، اور جھکتے، نکھتے کہیں گر نہ جائیں پل میں
ہر ایک شے کا نشان مٹا دیں،
انہیں کچھ اس کی خبر نہیں ہے
کھلونے بکھرے ہوئے پڑے ہیں،
فتادہ قالین سب کو سینے پہ لیے لیٹا ہوا ہے، دو چار سلوٹیں ہیں
وہ ساز ہیں فرش پر، یہ پنکھے، یہ سلے سلے ہوئے پریشاں لباس ہیں اور ٹوٹی ڈالی
ہوا کے جھونکوں سے بے خبر نیند کے سہانے سیاہ پردے میں کھو گئی ہے
میں جاگتا ہوں
میں دیکھتا ہوں
میں سوچتا ہوں
کھلونے بکھرے ہوئے پڑے ہیں!—

میراجی

"ر" کے نام

(ایک ادبی اجتماع کی یادگار)

تجھے اُس "محفلِ رنداں" میں بس اک بار دیکھا تھا
جلو میں تیرے لہراتے ہوئے مخمور میخانے
ہر اک جنبش میں اعضا کی چھلکتے مے کے پیمانے
تری ہستی، بس اک سرمستیوں کا موجزن دریا!

تری خاموشیوں میں نغمہائے سیمگوں خنداں
ترے نطقِ چمن آرا میں شیرینی شکر افشاں
تری نظروں میں جیسے گھس گئے ہوں نشتر و پیکاں
ترا ہر ہر اشارہ، گویا اک برقِ بلا ساماں
تری وارفتگی، جیسے خمارِ بحرِ بے پایاں
تری آسودگی، جس طرح کہساروں میں تخ باراں
تری میگوں نگاہیں بادہ ہائے شوق سے بوجھل
کہ جیسے پل میں بھرنے ہی کو وہ تیار ہوں جل تھل

ترا پیکر شریں بانسری کی تان تھا گویا
جو بن جائے سمٹ کر اک مجسم کیف و رعنائی
اجنتا اور ایلورا کے فنوں کی روحِ پُرعظمت
کہیں لینے لگے جس طرح اک مدہوش انگڑائی
مجسم ہو گئی ہو جیسے ارضِ مالوہ کی شب
اور اپنی دلکشی سے کر رہی ہو بزم آرائی
تو کیف و سرخوشی کی مے کا اک لبریز پیمانہ
کسی شاعر کی تخئیلِ حسیں کا ایک افسانہ

ترے حُسنِ فسوں پرور کی دل میں یاد باقی ہے
جو پھرتی ہے مری دنیا میں یوں تنہا و آوارہ
فضا پر تیرگی میں جیسے اک ٹوٹا ہوا تارہ
اور اس اجڑی ہوئی محفل میں جو مانند ساقی ہے!

عبادت بریلوی

ایورسٹ

اِک برف کی سِلی تھی مِری ارض کا آدرش
آذر کا تخیل بھی جسے چھو نہ سکا تھا!
ور خَلِیل کی نظر بھی جسے پگھلا نہ سکی تھی!
دامن پہ بکھر سکتے تھے کچھ دشت و چمن بھی
قدموں پہ مچل سکتے تھے کچھ گنگ و جمن بھی
برف آب و بخارات کا معدوم شوالہ! زنگولۂ سنگ اہرمنِ عرشِ ہمالہ!
اُچھلا، تو سرِ حلقۂ مہتاب بھی چمکا!
ڈوبا تو کبھی لوٹ لی ایتھر کی سحر بھی!
شکنوں پہ دَر و دَرہ و دامن کی بھی تڑپا!
اور بڑھ کے کبھی چوم لی شبنم کی نظر بھی!
کیا وہ خس و خاشاک میں تبدیل نہیں تھا
کیا وہ بھی مِری ارض کی قندیل نہیں تھا
کچھ زلزلے کروٹ تو بدل سکتے تھے اس میں کچھ تاج، اجنتا تو مچل سکتے تھے اس میں
ایورسٹ کی مضراب کو جنبش ذرا دینا
سطحوں پہ خلاؤں کی بہہ جاتے ہیں نغمے جھرنوں کی لپٹوں میں کھپے جاتے ہیں نغمے
یہ خواب کی وادی، یہ اندھا دُھند دُھندلکے
کیا سینۂ گیتی کی دھمک سُن نہیں سکتے؟
یہ برف کے پارے، یہ نِرے سنگ کے ریزے
بکھری ہوئی جگنو کی ضیا چن نہیں سکتے؟
اے کاش مرے غم میں یہ پھنس جائیں تو اچھا!
جتنے ہیں بلند اُتنے ہی دھنس جائیں تو اچھا!

اختر عرفانی

ہولی

(ایک پہاڑی دھن پر لکھا ہوا گیت)

اب نہ ابیر گلال
—— اُڑا سکھی ——
اب نہ ابیر گلال
رنگ ہے لوہو سے مہنگا اور دیش ترا کنگال

اِدھر کڑکتی بجلی طوفان اُدھر لگائے گھات
بھارت پہ چھائی ہے کب سے پاپن کالی رات
چندر گھرا بدلی میں پھیلا اندھیارے کا جال

اب نہ ابیر گلال
—— اُڑا سکھی، اب نہ ابیر گلال

پیٹ کی ہولی میں جلتا ہے مانوتا[1] کا ایندھن
دہلائے دیتی ہے جگ کو ان کے دل کی دھڑکن
پٹا پڑا ہے نرک میں ٹھٹھرے ڈھانچوں سے بنگال

اب نہ ابیر گلال
—— اُڑا سکھی، اب نہ ابیر گلال

خون میں رنگ ڈالا دنیا کو یورپ کی ہولی نے
آگ لگا دی گھر گھر میں پونجی واد کی ٹولی نے
پھاگ اڑاتے ہیں مُردوں کے ڈھیروں پہ چنڈال

اب نہ ابیر گلال
—— اُڑا سکھی، اب نہ ابیر گلال

چھُٹ لٹیروں جو آپس میں جوجھ[2] رہے ہیں بھیت
بکھر رہی ہے زنجیروں میں جکڑی دکھیا میت
انگ رہے ہیں رنگ جگت کے تن پہ نہ پھیرے اچھال

اب نہ ابیر گلال
—— اُڑا سکھی، اب نہ ابیر گلال

توڑ دے کیسر کی پچکاری، چھوڑ دے گلشن سنہلا
ان جھوٹے رنگوں سے کر ری بھولا من مت بہلا
ان کے دل کے خون سے اس دم بھومنڈل[3] ہے لال

اب نہ ابیر گلال
—— اُڑا سکھی، اب نہ ابیر گلال

پرکرتی دیوی[4] اب پھر جگ کو رنگ روپ دکھا دے
سینا[5] کی جوالا، دانو دل میں آگ لگا دے
اُٹھ اے شکتی[6] کرالی کالی اپنا تیغ سنبھال

اب نہ ابیر گلال
—— اُڑا سکھی، اب نہ ابیر گلال

کنول پرشاد کنول

۱؎ انسانیت
۲؎ جھگڑ رہے ہیں
۳؎ ساری دنیا
۴؎ تہذیب کی دیوی
۵؎ غلاموں کی فوج
۶؎ طاقت کی دیوی

التہابِ نظر

میں نے مانا کہ موت بیشک ہے
سفرِ زندگی بھی انتھک ہے!

پھر ستاروں نے آگ برسائی!
آج شاید جنوں میں ٹھنڈک ہے!

حُسن کی تشنہ کام نظروں میں
دل کی قیمت ترے جنوں تک ہے!

تیرے آنچل کی سرسراہٹ سے
غنچوں میں تازگی ہے ٹھنڈک ہے!

کیوں نہ ہو عشق سلسلہ آغاز
حُسن جب دلکشی کی حد تک ہے!

التہابِ نظر معاذ اللہ
مرتعش روح، دل میں دھک دھک ہے

حُسنِ نظّارہ، ہیچ ہیچ شراب
نشہ میں روشنی ابھی تک ہے

پھونک دی پھونک دی بنائے قفس
آشیاں حدِ آشیاں تک ہے

لب بہ لب جام، لب بہ لب صہبا
رونقِ میکدہ سحر تک ہے

صہباء

رقصِ تصوّر

ٹھیک ہے تم پہ میرا کیا زور
ڈھونڈ لو اپنے دل کا چور

ہم آہنگ نظامِ عالم!
نغمۂ دل پھر کیوں پر شور

رقصِ تصور ویراں ویراں
ناچ رہا ہے بن میں مور

میں تو بس اک دیوانہ تھا
کس کے مرنے کا ہے شور

آج بہت رنگیں سب ساغر
آج کہاں ہاتھوں میں زور

سلجھی سلجھی ساری فضائیں
اُلجھی اُلجھی دل کی ڈور

مے نوشی کو سہارا کیسا
چھٹنے دو یہ گھٹا گھنگھور

کب سے سوئے رہی مالنیا"
پھلواری میں لاگا چور

بیچ کے سلام آئینہ دیکھو
یہ سایہ ہے آدم خور!!

سلام مچھلی شہری

دو غزلیں

دور گردِ خس و خاشاک ہوئی جاتی ہے
سارے عالم کی فضا پاک ہوئی جاتی ہے

دیکھ! شہبازِ خرد مائلِ پرواز ہوا
ابھی پیمائشِ افلاک ہوئی جاتی ہے

علم کے نور سے اب تا بہ گذرگاہِ خیال
وسعتِ سرحدِ ادراک ہوئی جاتی ہے

آج سرگرمیٔ پیہم سے تری ابرِ کرم
مے فشاں خود ہی رگِ تاک ہوئی جاتی ہے

کس قدر زور پہ ہے نشۂ صہبائے بہار
ہر شگوفے کی قبا چاک ہوئی جاتی ہے

آتشِ عزم کو پھونکوں سے بجھانے والو
زندگی شعلۂ بیباک ہوئی جاتی ہے

تیری محبوب نگاہوں نے جسے روکا تھا
وہ نظر اور بھی چالاک ہوئی جاتی ہے

وجدؔ معصومیٔ تکرارِ تبسم کے نثار
زندگی شعرِ طربناک ہوئی جاتی ہے

سکندر علی وجدؔ

جو غمِ حبیب سے دور تھے وہ خود اپنی آگ میں جل گئے
جو غمِ حبیب کو پا گئے وہ غموں سے ہنس کے نکل گئے

جو تھکے تھکے سے تھے حوصلے وہ شباب بن کے مچل گئے
جو نظر نظر سے گلے ملی تو بجھے چراغ بھی جل گئے

یہ شکستِ دید کی کروٹیں بھی بڑی لطیف و جمیل تھیں
میں نظر جھکا کے تڑپ گیا، وہ نظر بچا کے نکل گئے

جو سنبھل سنبھل کے بہک گئے وہ فریب خوردۂ راہ تھے
وہ مقامِ عشق کو پا گئے جو بہک بہک کے سنبھل گئے

نہ خزاں میں ہے کوئی تیرگی نہ بہار میں کوئی روشنی
یہ نظر نظر کے چراغ ہیں کہیں بجھ گئے۔ کہیں جل گئے

غم و عیش و یاس و امید کا نہ اثر حیات پہ ہو سکا
مری روحِ عشق وہی رہی یہ لباس تھے جو بدل گئے

یہ فروغِ بادہ و جام کیا۔ یہ حدیثِ نغمہ و ساز کیا
جو ترے شباب سے بچ رہے وہ شرابِ شعر میں ڈھل گئے

جو کھلے ہوئے ہیں روش روش وہ ہزار حسنِ چمن سہی
مگر ان گلوں کا جواب کیا، جو قدم قدم پہ کچل گئے

نہ ہے شاعرؔ اب غمِ نو بہ نو نہ وہ داغِ دل نہ وہ تازگی
جنھیں اعتمادِ بہار تھا وہی پھول رنگ بدل گئے

شاعرؔ لکھنوی

اُردو اور مشترکہ تہذیب
ترقی پسند ادب
اُردو شاعری
اُردو کا مستقبل
کلچر اور فرقہ پرستی
غزل کا ماضی، حال اور مستقبل
ہندی × ہندوستانی
خاکے

جائزے

ادب زندگی کی تخلیق کرتا ہے اور زندگی ادب کی خالق ہے!

یہ فنکار

قاضی عبدالغفار

"لیلیٰ کے خطوط" کے ساتھ قاضی عبدالغفار کا نام یاد آتا ہے اور قاضی عبدالغفار کے ساتھ "لیلیٰ کے خطوط" ۔ "شاہدِ حق کی گفتگو" میں "بادۂ و ساغر کہے بغیر" نہیں رہتے ۔ مولانا محمد علی کے رفیقِ صحافت رہ چکے ہیں ، حیدرآباد سے "۔ ۔ ۔ ہے" ادب و صحافت کا "پیام" دیتے رہے ہیں ۔ اپنے خطبۂ صدارت میں بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں آپ نے نوجوان فنکاروں کی صحیح رہبری کرتے ہوئے ادیبانہ قیادت کا پوری طرح فرض انجام دیا ہے ۔

فراق گورکھپوری

جتنے اچھے شاعر ہیں اُتنے ہی اچھے ناقد بھی ، اِن کی شاعری رنگ و نور کا لچکیلا امتزاج ہے اور انھوں نے نئی روح ، نیا اظہار ، اور لطیف معصومیت اُردو شاعری کو بخشی ہے ، آپ نے اُردو پر غیر قومی ہونے کے الزام کی تردید کرتے ہوئے یہ بات صاف طور پر کہدی ہے کہ ہماری شاعری بڑی معصوم ، فطری اور جمہوری رہی ہے ۔

نیاز فتحپوری

نیاز پر اُردو ادب کو ناز ہے ، "نگار" کے نقوش سرزمین بھوپال ہی میں اُبھرے جہاں اب "افکار" تاریکی میں روشنی پھیلا رہا ہے ۔ نیاز کی تنقیدات اور نگارشات کا شمار ادب عالیہ میں ہوتا ہے ، آپ نے قومی زبان کے مسئلہ پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے اور ملک کے جواں افکار ادیبوں کی بروقت رہنمائی کی ہے ۔

ممتاز حسین

کتابی کیڑہ ، "کالی لڑکی" کا ساؤنو لا سلونا خالق ، ریسرچ کا دیوانہ "بھوپال تال" کا پانی پی کر ایسا گیا کہ بحرِ ہند کے ساحل پر ہی بیقرار موجوں میں قرار ملا ۔ "کلچر اور فرقہ پرستی" پر محققانہ نظر ڈالی ہے ۔

اختر انصاری

کامیاب فنکار ہے ، سہل نگاری کا شکار ہے ۔ جب بھی کچھ لکھا ہے سوچ سمجھکر لکھا ہے ، غزل کے ماضی حال اور مستقبل پر عالمانہ بحث کی ہے ۔

ڈاکٹر مسعود حسین

تنقید خاص موضوع ہے ، اُسلوب نگارش دلکش ہے ۔ زبان کے مسئلہ پر ان کا نقطۂ نظر ذرا تیکھا ہے ۔

احمد ندیم

پشاور سے اتیھر کی موجوں پر بکھرتے بکھرتے اب یہ محبوب افسانہ نگار اور شاعر بیزار ہوگیا ہے ، اِن دنوں "بہن ہاجرہ مسرور" کے "اشتراک" سے "نقوش" میں رنگ بھرنے کی کوشش کر رہا ہے —— "خاکے" اُس کا بے لاگ اور پُرخلوص تبصرہ ہے ۔

راشدی

ڈاکٹر سید محمود

اُردو اور مشترکہ تہذیب

ڈاکٹر سید محمود وزیر بہار نے اردو کانفرنس لکھنؤ کا افتتاح فرماتے ہوئے کہا:۔

" اُردو کا لفظ دراصل سنسکرت کے ایک لفظ سے نکلا ہے جس کا مطلب کئی چیزوں کا مرکب ہے اور غالب نے بھی اسے انھیں معنوں میں استعمال کیا ہے"۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں اُردو، ہندی اور ہندستانی کو بڑی حد تک ہم معنی سمجھتا ہوں اور یہ مشترکہ زبان، ہندستان میں مغل شہنشاہی سے پہلے نہیں تو کم سے کم اسی زمانے سے رائج ہے۔ قرون وسطیٰ میں یہ زبان دہلی سے پٹنہ تک بولی جاتی تھی اور اُس نے تمام فرقوں کو ایک تمدنی سلسلہ میں منسلک کر دیا تھا، لیکن قائداعظم کے دو قومی نظریے نے "دو قومی نظریہ" ایجاد کر کے اس مشترکہ تمدن کو بہت زبردست نقصان پہنچایا۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ یہ نظریہ آج ختم ہو چکا ہے اور اب اگر اس کے ردِ عمل میں مشترکہ تمدن کی ترجمانی کرنے والی زبان کو مٹانے کی کوشش کی جائیگی تو اس سے اُس نظریہ کو تقویت پہونچے گی۔ اُنھوں نے کہا کہ پچھلے دنوں ملک جس مصیبت میں گرفتار ہوا ہے اس کی ابتداء دراصل زبان ہی کے مسئلہ سے ہوئی ہے۔

اُنھوں نے ان لوگوں پر نکتہ چینی کی جو کہتے ہیں کہ 'ہندستانی' زبان کا کوئی وجود ہی نہیں ہے اور اس سلسلہ میں بہار کی پچھلی کانگریسی وزارت کی قائم کی ہوئی ہندستانی کمیٹی کا ذکر کیا جس نے اس مشترکہ زبان کی ایک لغت اور گرامر تک تیار کر لی تھی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ کمیٹی کے سامنے صرف دس فیصدی بلکہ شاید اس سے بھی کم الفاظ ایسے آئے تھے جو الگ الگ تھے ورنہ دونوں زبانوں کے تمام الفاظ مشترک تھے۔ اس تھوڑے سے اختلاف کی بنا پر دو میں سے کسی ایک زبان کو ختم کر دینا صحیح نہیں ہے۔

آپ نے عام طور پر استعمال کے لئے اُس زبان کی مخالفت کی جو سنسکرت آمیز ہے اور ہندی کے نام پر رائج کی جا رہی ہے اور جس کی وکالت مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کر رہے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ قانونوں کے ذریعہ زبانیں نہیں بنا کرتیں۔ اور اس سلسلہ میں آپ نے حکومت یو۔پی کے فیصلہ پر اظہار افسوس کیا۔

ڈاکٹر محمود صاحب نے کانگرس اور گاندھی جی کی پالیسی کی وضاحت کی جس کا اصول یہ ہے کہ ہندستانی زبان اُردو اور ہندی دونوں رسم الخط کے ساتھ لکھی جائے۔ اُنھوں نے کہا کہ جہاں تک زبان کے نام کا تعلق ہے، مجھے لفظ ہندی پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ زبان عام بول چال کی ہو۔ رسم الخط کے متعلق اُنھوں نے کہا کہ ہم کو رومن رسم الخط اختیار کر لینا چاہئے۔ اس سلسلہ میں دشواریاں ضرور ہیں، لیکن ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

تقریر ختم کرتے ہوئے اُنھوں نے ترقی پسند مصنفین کی کوششوں کی تعریف کی اور فرمایا کہ وہ پرانے لوگوں کے ہاتھ سے یہ مسئلہ چھین کر اسے حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

قاضی عبدالغفار

ترقی پسند ادب!

(خطبۂ صدارت جو اُردو کانفرنس لکھنؤ کے افتتاحی اجلاس میں پڑھا گیا)

ترقی پسند ادب اب اپنے ارتقاء کی اُس منزل پر پہنچ گیا ہے جہاں کہ اُس کے اچھے یا بُرے کی بحث اور اُس کے متعلق ردّ و قبول اور نکتہ چینی اور اُس کے جواب الجواب کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ کوئی کچھ ہی کہے لیکن ترقی پسند ادب ہماری زندگی میں اپنی جگہ پیدا کر چکا ہے۔ عوامی زندگی کے موجودہ ماحول میں وہ اپنا راستہ بنا چکا، اور اب وہ اتنی ہی بڑی حقیقت ہے جتنی کہ خود ہمارے عوام کی زندگی۔ قدیم آرٹ اور قدیم فن تنقید کے کسی نقطۂ نظر سے نقد و نظر کے کتنے ہی جال بچھائے جائیں یہ پرندہ اب اُن میں پھنسنے والا نہیں۔ اس لئے میں آج کی صحبت میں اس بحث پر معترضین سے کچھ کہنا نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ جدید ادب بُرا ہے تب، اور اچھا ہے تب، اُس نے عوام کی زندگی سے اپنا رشتہ قائم کر لیا اور اب اس حقیقت پر کسی سند کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اس ادب کا قافلہ اپنے راستہ پر اُس وقت تک بڑھتا ہی چلا جائیگا، جب تک کہ وہ ملک کے عوام کی زندگی سے اپنا اتّصال قائم رکھے اور جب تک اُسے قبول عام کی سند حاصل رہے۔ اُس کی اور ہر زبان کی ترقی اور بقا کی صرف یہی ایک ضمانت ہوتی ہے۔

۱۵ اگست کے بعد جب نصف صدی سے زیادہ کی جدوجہد اور ہر قسم کی بیشمار قربانیوں کے بعد قومی آزادی کی ایک جھلک ہم نے دیکھی، جدید ادب اور ترقی پسندوں پر پہلے سے بہت زیادہ فرائض عائد ہوگئے۔ اُنھوں نے آزادی کی مسرتوں میں بربادی کے خوں چکاں مناظر بھی دیکھے، اُنھوں نے اپنے ملک کے نااہلوں کو آزادی کی بدہضمی میں مبتلا دیکھا اور وہ آزادی کے اندر ہی بربادی اور از سرِ نو غلامی کے امکانات سے بھی آشنا ہوئے جو ڈیڑھ سو برس کی بدترین ذہنی اور سیاسی غلامی کے ناگزیر نتائج ہیں۔ ہمارے وطن کی تاریخ میں یہ عجیب مقام ہے جہاں ہم کھڑے ہیں، اس مقام پر آزادی اور غلامی قدمے فاصلہ دارد۔ ایک ہی قدم ہمارے مستقبل کو جنت بھی بنا سکتا ہے اور جہنّم بھی۔ اس پل صراط پر جدید ادب کو ایک بہت بڑے امتحان سے گذرنا ہے اور قرائن یہ ہیں کہ ہمارے ادیب اس امتحان میں پورے اتریں گے۔ معدودے چند ادیبوں کے سوائے ہماری جماعت نے یک جان و یک جسم ہو کر افتراق تقسیم اور فتنہ و فساد کے اُن عناصر کو ٹوکا ہے جنھوں نے انگریز کے آغوش میں پرورش پائی تھی اور جو انگریزی حکومت کی ایک زہریلی وراثت بن کر ہماری شہ رگ سے لپٹے ہوئے ہیں۔ انگریز کے چابکدست تدبّر نے اپنے بہت چست و چالاک کارندے اس ملک میں پیدا کئے اُن ہی کی فرقہ پرست جماعتوں کا یہ پورا قبیلہ تھا جس نے سیاست کی گردن پر مذہب کے بتوں کو مسلّط کر دیا اور ایک فتنہ پرور دو قومی نظریہ کو آگے لاکر بد امنی کی اُس وراثت کو پوری طرح محفوظ کر دینے کی کوشش کی جو انگریزوں نے ہمارے لئے چھوڑی تھی۔ یہ کوئی سیاسی مجلس نہیں ہے جس میں میں انگریزی حکومت کے ان فرقہ پرست کارندوں کا جائزہ لوں، تاہم اتنی بات تو صرف اس لئے کہنی پڑی کہ ملک کی موجودہ حالت سے جدید ادب کو بے تعلق نہیں رکھا جا سکتا۔ مجھے خوشی ہے کہ اُس وقت جب دو دیوانے فرقے ایک دوسرے کا خون بہا کر گذشتہ غلامی کی ذلتوں اور رسوائیوں کا اعادہ کر رہے تھے ترقی پسند ادیبوں نے اس صورت حال کے خلاف اپنی متحدہ آواز بلند کی اور اپنے قلم کو اس فتنے کے مقابلہ میں مصروف رکھنے کی ٹھان لی۔ اس وقت جبکہ قدیم ادب کے خوف خوردہ اور کمزور اعصاب کو دہلی اور پنجاب کی خونریزی نے اور بھی زیادہ کمزور کر دیا ہے، ادب کے وہ تمام ترقی پسند عناصر جو جدید ادب کی

تعمیر میں مصروف ہیں، ایک نقطۂ اتحاد پر سمٹ آئے ہیں اور انھوں نے اپنے اس عزم کا اعلان کر دیا ہے کہ جس طرح وہ آزادی سے پہلے غیر ملکی سرمایہ داری اور سامراج کے خلاف کام کرتے رہے ہیں اُسی طرح وہ ملکی فسطائیت کے ہر گوشہ پر حملہ کریں گے۔ خواہ وہ لیگ ہو یا مہا سبھا ہو یا خود کانگرس ہو۔ جہاں کہیں بھی اس زہر کا ایک قطرہ موجود ہوگا اُس کو ترقی پسند ادیبوں کے قلم کی نوک ضرور کریدے گی۔ اگر جدید ادب اس نازک دور میں اُن حالات سے غافل رہتا جو دہلی اور پنجاب میں ایک بے شرم فسطائیت اور نوزائیدہ جمہوریت کے درمیان ——— یا یوں کہوں کہ انسانیت اور حیوانیت کے درمیان ——— موجودہ کشمکش نے پیدا کر دیئے ہیں تو وہ اس قابل نہ تھا کہ زندہ رکھا جاتا اور اسے زندہ رہنے کا کوئی حق بھی باقی نہ رہتا۔ اس امر کا ثبوت کہ وہ زندہ ہے اُس کی وہ آواز ہے جو بلند ہوئی ہے اور وہ جدوجہد ہے جو شروع کی گئی ہے۔

یوم آزادی کے بعد پنجاب اور دہلی کے جس فتنے نے سر اُٹھایا اُس کی زد میں خود کانگرس کے بھی بہت سے گوشے آگئے اور ہم نے دیکھا کہ ایک بے ایمان فسطائیت، جمہوریت کا خوشنما نقاب چہرے پر ڈالکر میدان میں آگئی۔ لیکن وہ نقاب بہت باریک تھا حقیقی خد و خال کچھ زیادہ چھپ نہ سکے۔ ان جمہوری بہروپیوں کے علاوہ حکومت کے حلقہ میں کچھ ایسے لوگ بھی نمایاں ہوئے جن کی جمہوریت پر حکومت کے اقتدار کا نشہ حاوی ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ زندگی کا صرف ایک ہی رُخ دیکھنے لگے ——— مجھے یاد ہے ——— یہ بات بھولنے کی بھی نہیں ——— کہ ایک صوبہ کے وزیر اعظم نے جن کو میں ہمیشہ وسیع الخیال، قوم پرست سمجھا کیا اور اب بھی سمجھتا ہوں، ایک دن مجھ سے کہا کہ جب دو بھائیوں کے درمیان آبائی مکان تقسیم ہوگیا اور دونوں نے اپنا اپنا حصہ لیا تو پھر ایک بھائی دوسرے بھائی سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنا تو حصہ حاصل کر لیتا ہوں لیکن دوسرے کے حصہ میں بھی کچھ نہ کچھ میری شرکت ضرور رہیگی۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک غیر منطقی صورت ہے۔ تقسیم ہے تو وہ پھر پوری تقسیم ہو۔ اب ایک کے حقوق دوسرے کے حصہ میں باقی نہیں رہ سکتے۔ مجھے یہ بات سن کر تعجب نہیں ہُوا اس لئے کہ تقسیم کے یہ نتائج تو پہلے ہی سے مسلمان قوم پرستوں کی نظر کے سامنے تھے اور ان ہی کی پیداوار میں انھوں نے ہر طرح کی گولیاں نہیں اور لعنت کے طوق پہنے، لیکن ایک قوم پرست کی حیثیت سے میرے اور کسی بھی ترقی پسند ادیب کے سامنے ہندو اور مسلمان کی کسی امتیاز کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ میں اگر یونین کے کسی صوبہ میں زندگی بسر کرتا ہوں تو مسلمان کی حیثیت سے نہیں۔ میرا مذہب میرے گھر کے اندر کا معاملہ ہے۔ بلکہ صرف ایک ہندستانی کی حیثیت سے۔ عوام کی زندگی میں مذہب کے سوال کو آلۂ کار بنانے کے لئے پیدا کیا گیا، ورنہ اگر کوئی مسئلہ ہے تو ہندو و مسلمان کا مسئلہ نہیں بلکہ روٹی اور بھوک، اور زندگی کے معاشی وسائل کی تقسیم کا معاملہ ہے۔ مقابلہ ہندو مسلمان کا نہیں بلکہ عوام کے دو بڑے طبقات کا ہے جن میں سے ایک دوسرے کا خون چوس رہا ہے اور اب تک سامراجی حکومت کی سایۂ عاطفت میں پل رہا ہے۔ جدید ادب کو اس طبقہ واری جماعتوں کی جنگ میں عوام کا ساتھ دینا ہے۔ اس لئے وہ اگر فرقہ واری جماعتوں کے علاوہ ان رجعت پرست عناصر کا بھی مقابلہ کرے جو جمہوری جماعتوں کے مختلف گوشوں میں چھپے ہوئے ہیں، تو یہ اُس کا فرض ہے اور یہ اس کو کرنا ہے۔

اسی بحث کے سلسلہ میں قومی زبان اور اُس کے متعلقہ مسائل کا ذکر کرنا ضروری ہے، اس لئے کہ یہ مسائل اب حکومت کی پوری قوت کے ساتھ ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ کوئی قومی زبان بھی حکومتوں کے زور سے نہیں بنا کرتی اور نہیں بن سکتی، اور اگر بنے تو وہ قومی زبان نہیں۔ دنیا کی تاریخ اور علم اللسان کی پوری تاریخ کو کوئی اقتدار یا حکومت جھٹلا نہیں سکتا۔ قومی زبان وہی ہوتی ہے جسے عوام قبول کریں۔ ہندستان کے اس ابتدائی دور میں ہندو اور مسلمانوں کے سنگم پر جس زبان کا آغاز شروع ہُوا وہ وہی زبان تھی جو ہندو مسلمانوں کے قدیم زبانوں کے میل سے بنی۔ انگریز حکومتیں کسی زبان کے بنانے پر قادر ہوتیں۔ مغلوں کے دور میں فارسی اس ملک کی زبان بنی ہوتی۔ لیکن دو قوموں کا اتصال فارسی کے زوال کا باعث ہُوا۔

اور ایک نئی زبان نے جنم لیا، جسے آج ہم **ہندستانی** کہتے ہیں۔ مگر دو قومی نظریہ کے فتنہ انگیز سحر نے جو مسلمان عوام کو بہکایا تو ہندو لیڈر بھی اس سے متاثر ہوئے اور میکڈانل جیسے سامراجیوں کے پرانے حربے جس کو گذشتہ پچیس سال کی قوت بیداری نے بیکار کر دیا تھا، پھر اٹھائے گئے اور فرقہ پرست ہندو نے کہا کہ جب تقسیم ہی ٹھہری تو ہر چیز تقسیم ہوگی۔ زبان بھی تقسیم ہوگی، تہذیب بھی تقسیم ہوگی، کلچر بھی تقسیم ہوگا، روٹی بھی تقسیم ہوگی، علوم و فنون بھی تقسیم کر ڈالے جائینگے، پاکستان اگر اسلامی ریاست ہے تو ہندستان میں ہندو راج کیوں نہ؟ دو قومی نظریہ نے تمام غیر مسلم فرقہ پرستوں کی تمنائیں ختم کر دیا اور بدبختی کے اس شجر کا یہی سب سے زیادہ تلخ ثمر تھا جس کی تلخی سے اب ہمارے منہ کا مزہ خراب ہے۔ مگر فرقہ پرستی کے اس تمام جوش و خروش نے تاریخ کی اس مسلمہ حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ زمین اور اشیا اور سامان خانہ داری کی طرح، تہذیب اور کلچر تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا دستور تو صرف یہ ہے کہ قدیم تہذیب پر نئی تہذیب فتح پاتی ہے، لیکن جب کوئی تہذیب بنتی ہے تو وہ آری یا قینچی سے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ آج ہندستانی یونین کی زبان کے متعلق جو ہنگامہ برپا ہے میں اسے ایک عارضی نشہ کی کیفیت سمجھتا ہوں، جو سال دو سال کے اندر ختم ہو جائیگی اور جب زندگی کی حقیقتیں سامنے آئیں گی، فرقہ پرستی کو ٹھوس معاشی مسائل سے شکست کھانا پڑیگی۔ اور حکومت کے نشہ اور ضد پر قبول عام فائق ہوگا، پھر ایک توازن قائم ہو جائیگا، اور نہ تو مسلمان احمقانہ دعویٰ کریگا کہ اردو اس کی مخصوص قومی زبان ہے اور نہ ہندو ہندستانی زبان کی گردن میں قدیم سنسکرت کے بھاری پتھر لٹکا کر کوئی خالص ہندو زبان پیدا کرنے کی کوشش کریگا۔ موجودہ ذہنی انتشار کا یہ بھی ایک نمونہ ہے کہ آج بعض صوبوں کی حکومتوں نے ہندی اور سنسکرت کا ایک نیا مرکب قومی زبان کے نام سے پیش کر دیا ہے اور اب قانون اور حکومت کی پوری قوت سے وہ زبان عوام کے حلق کے نیچے اتاری جا رہی ہے۔ حالانکہ یہ حکومتیں کانگریسی حکومتیں ہیں اور زبان کے متعلق نہ صرف کانگرس کا فیصلہ اپنی جگہ قائم ہے بلکہ مہاتما گاندھی بار بار اس فیصلہ کو دہراتے رہے ہیں۔ یہ صرف حکومتی اقتدار کے نشہ کی کیفیت ہے جو کانگرس کے اصولوں سے بھی کانگریسی حکومتوں کو روگرداں کر رہی ہے۔ خود ہمارے صوبہ میں جہاں آج یہ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے زبان کو بدلنے اور ایک خالص ہندو زبان کو پیدا کرنے کی بہت ہی جاہلانہ اور بھونڈی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ لیکن میں مطمئن ہوں کہ یہ ذہنی کیفیت محض عارضی ہے۔

جہاں تک جدید ادب کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے سامنے زبان کے لئے کسی نئے قالب کو ڈھالنے کا سوال نہیں ہے۔ یہ قالب تو صرف عوام ہی ڈھال سکتے ہیں۔ اور وہ اپنے احوال میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ ہندستانی زبان سے فارسی، عربی اور سنسکرت کے بھاری پتھروں کو حالات کے نئے تقاضے خود ہی ہٹا رہے ہیں اور عوام وہی زبان بول رہے ہیں جسے وہ اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اس زبان کو بدلنے کی ہر کوشش بالآخر ناکام ہوگی۔ اگر حکومتوں کو کوئی قومی زبان بنانی ہے تو اس کا کوئی طریقہ کسی قانون اور قاعدہ کے اندر، یا کسی عاملانہ اقتدار کے پردے میں موجود نہیں۔ ان لوگوں سے جو صرف حکومت کے زور سے زبان کو بدلنا چاہتے ہیں میں صاف صاف کہتا ہوں کہ زبان کے رائج کرنے کا صحیح طریقہ صرف ایک ہی ہے، وہ یہ کہ جس صوبہ کی عام زبان کا تصفیہ کرنا ہو، اس کے متعلق علاقوں سے ان عام فہم الفاظ کا ذخیرہ جمع کر لیا جائے جو عوام بولتے ہیں اور پھر ان کی مسلمہ عمومیت کے اعتبار سے انہیں زبان کے اندر داخل کیا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر صوبہ جات متحدہ میں یہ عمل اختیار کیا جائے تو زیادہ الفاظ ہندی زبان ہی کے ملیں گے، جنہیں زیادہ سے زیادہ رائج کرنا موزوں اور مناسب ہوگا، لیکن سنسکرت کے ایسے بھاری پتھر بہت ہی کم ہاتھ آئیں گے جیسے کہ اب عوام کی زبان میں ٹھونسے جا رہے ہیں اور نہایت تکلیف دہ اور تمسخر انگیز یہ لطیفہ ہے کہ جو اصحاب ان الفاظ کو ٹھونس رہے ہیں، وہ خود ان الفاظ کے صحیح طور پر استعمال کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ ہم یہ تماشے تو روز دیکھتے ہیں کہ ایک اچھی خاصی صاف و سادہ ہندستانی زبان بولنے والے لیڈر جب پبلک پلیٹ فارم پر آتے ہیں تو دفعتاً اپنے گھر کی اور اپنے خاندان کی زبان بھول کر

ایسی باتیں کرنے لگتے ہیں کہ گویا ہندستان کی تاریخ میں ———— زیادہ نہیں تو دو ہزار برس بازگشت کر لی یا وہ سمجھتے ہیں کہ پیچھے ہٹ کر وہ قدیم تہذیب کو پھر ایک دفعہ جگا دیں گے۔ لیکن دنیا کی کوئی تہذیب خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھے زمانہ کے انقلابات کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ دور کیوں جائیں ایرانیوں نے جدید ایران اور ترکوں نے جدید ترکی میں ایک خالص تورانی اور ایرانی تحریک کا علم بلند کیا، لیکن چند روز کے تجربے کے بعد وہ تحریکیں ناکام ہو گئیں ہندستان کے مسلمانوں نے خلافتِ اسلامیہ کے احیاء کا ایک محاذ قائم کیا جس میں کانگرس نے بھی اُن کا ساتھ دیا، لیکن خلافت ختم کر دی گئی اور اس تحریک کے غبارے کی ہوا نکل گئی۔ غرض یہ ہے کہ کوئی قوم اپنی آزادی کا نام لے کر زمانہ کے سیلاب کو نہیں روک سکتی، یہی حال ادب کا بھی ہے کہ کوئی ادب جو زمانے کے تقاضوں سے کترائیگا یا عوام کی زندگی سے دور رہیگا، پنپ نہیں سکتا۔ اس تمام بحث میں رسم الخط کا سوال ضرور ایسا ہے جس کے متعلق جدید ادب کے حامیوں کو جلد سے جلد کوئی فیصلہ کرنا ہے ———— اس لئے کہ آیندہ زبان کی ترقی کا انحصار زیادہ تر اُس کے رسم الخط پر ہوگا۔ ابھی تک کانگرس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک ہندستانی زبان اور دو رسم الخط رائج کئے جائیں۔ مسلمان اس خیال سے گھبراتا ہے کہ جب دو رسم الخط رائج ہوں گے تو غالباً اردو رسم الخط پر ہندی رسم الخط فائق ہو جائیگا۔ درحقیقت یہ سوال بہت زیادہ غور و فکر کا محتاج ہے اور جس قدر غور و فکر کا وہ مستحق ہے اُس سے وہ محروم رہا ہے۔

مجھے اعتراض اس بات پر ہے کہ اُردو کے فرقہ پرست حامیوں نے اُردو زبان کی طرح اُردو رسم الخط کو بھی اپنے فرقہ کے لئے مخصوص قرار دیکر اُس کی بنیادیں کمزور کر دیں۔ اب تو فیصلہ صرف اس بات پر ہوگا کہ کونسا رسم الخط افادیت کے نقطۂ نظر سے زمانہ کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس سوال کے جانچنے کا اس کے سوا کوئی اور پیمانہ نہیں۔ زبان کی ترقی کے مسئلہ پر غور کرنے میں ہمیں جذبات سے کام نہ لینا چاہیئے۔ طباعت و کتابت کی موجودہ خرابیوں کو رفع کئے بغیر اور رسم الخط کو زیادہ سے زیادہ سائنٹفک بنائے بغیر ہم اپنی مشکلات کو حل نہیں کر سکتے۔ ہمارے قدامت پسند "اہل زبان" اپنی قدامت سے اس قدر لپٹے ہوئے ہیں کہ کسی تغیر کے امکان کا تصور بھی گوارا نہیں کرتے۔ اگر وہ جذبات سے بچ کر مسائل پر نظر کریں اور دیانتداری سے فیصلہ کریں تو انہیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ کوئی رسم الخط جو نشر و اشاعت کی موجودہ ضروریات پوری نہ کر سکے قومی رسم الخط نہیں بن سکتا۔ لہٰذا انہیں غور کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے ملک کی عوامی زبان کو ترقی دینے کے لئے کونسا رسم الخط اختیار کریں۔ میں تو یہ بات پندرہ بیس سال سے کہتا رہا ہوں، اور پھر کہتا ہوں کہ اب ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد ہمیں اس قسم کے مسائل کو بین الاقوامی نقطۂ نظر سے دیکھنا ہے اور اُن لوگوں کا جرأت کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے جو ابھی تک محدود مقامی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ ہندستان کو اقوام عالم کی صف میں اپنی ایک ممتاز جگہ حاصل کرنی ہے اور علوم و فنون اور آرٹ اور سائنس کی ترقی کے راستوں پر دوسری اقوام کے دوش بدوش چلنا ہے۔ ہماری قومی زبان کو سات سمندر عبور کرنے ہیں، اور اپنے ترقی پسند ادب کو تمام دنیا کے سامنے لے جانا ہے۔ رومن رسم الخط ایک بین الاقوامی رسم الخط ہے اور اگر ہم اُس کو اختیار کر لیں تو ہماری زبان اور ہمارا ملک اس طریقہ سے بین الاقوامی حیثیت پیدا کرنے کے زیادہ قابل ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں توقع رکھتا ہوں کہ ترقی پسند ادیب پوری توجہ کے ساتھ اس مسئلہ پر غور کریں اور عہد جاہلیت کے زعماء کی طرح صرف یہ کہہ کر اس بحث کو ختم نہ کر دیا کریں کہ ہمارے باپ دادا کا تو طریقہ یہی تھا، اس لئے یہی ہمارا طریقہ ہے۔ بھول نہ جایئے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی ہندستان اُس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے افکار اور اپنے تخیل کو ایک بوسیدہ اور تھکی ہوئی قدامت سے آزاد نہ کرے۔

مجھے آج کچھ زیادہ عرض کرنا نہیں ادب کے دوسرے ضروری مسائل کانفرنس کے جلسوں میں آپ کے سامنے آنے والے ہیں۔ ان کو صرف "مقامی حب وطن" کے نقطۂ نظر سے نہ دیکھئے بلکہ یہ بھی یاد رکھئے کہ اب ہندستان ـــ عالمی سیاست اور عالمی تہذیب کا مرکز نظر بن گیا ہے اور اس کے دوست و دشمن سب یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ کس حد تک اپنی آزادی کا اہل ثابت ہوگا۔ ترقی پسند ادیبوں سے میری غرض یہ ہے کہ ہمارے ادب کو فیشن نہ بنایئے۔ نہ صرف محفل آرائی کے لئے کھلونا بنایئے۔ اسے تو جہد حیات و تنازع بقا میں قومی تہذیب کے اسلحہ خانہ کی ایک مؤثر تلوار بناکر استعمال کرنا ہوگا۔

فراقؔ گورکھپوری

اُردو شاعری

(خلاصہ صدارتی تقریر اجلاس نظم اُردو کانفرنس لکھنؤ)

اُردو شاعری پر عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں "بھارتیتا" یعنی ہندوستانی تہذیب کی روح نہیں ہے لیکن درحقیقت شاعری کے بہت خراب نمونے پیش کر کے اُردو پر یہ تہمت لگائی جاتی ہے۔ یہ الفاظ پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے اُردو کانفرنس کے چوتھے اجلاس یعنی شعبۂ نظم کی صدارت کرتے ہوئے کہے۔

فراق صاحب نے اعتراضات کے جواب میں ثبوت پیش کرتے ہوئے کہا:۔

"بھگوت گیتا کے دو تین اُردو ترجمے موجود ہیں لیکن ہندی میں کوئی ایسا نمونہ نہیں جسے ادبی حیثیت دی جا سکے رامائن کے دو تین ترجمے (والمیک رامائن (نثر میں) شری بھگوت کا ترجمہ اور رامائن کے واقعات پر متعدد نظمیں کہی گئی ہیں — اجنتا، اودے شنکر، ہمالہ، گائے، سری کرشن، گوکھلے، گنگا پرشاد ورما، گوتم بدھ، ساوتری، ست دان سودا ناتھ، میگھ دت وغیرہ پر اُردو میں نظمیں اور کتابیں بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

یہاں کے مناظر مشہور مقامات، دریا، پہاڑ، قدیم مقامات، غرضکہ موضوعات کے لحاظ سے اُردو میں ہندوستانی زندگی کا ہر پہلو موجود ہے۔ یہ جھوٹ اور غلط ہے کہ یہاں گل و بلبل۔ لیلےٰ مجنوں، شیریں فرہاد وغیرہ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ پچھلے سو سال میں ہندوستان کی کسی زبان میں ویدانت کے خیال کی ترجمانی کرنے والی ایسی شاعری نہیں مل سکتی جیسی ہماری تصوف کی شاعری میں موجود ہے۔ اس کو سُن کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خود شنکر اچاریہ بول رہے ہیں۔

قومی جدوجہد، ملک کی آزادی اور انقلاب کے سلسلے میں جتنی نظمیں اُردو کے شاعروں کی خلاف قانون قرار دی گئی ہیں اور ان کے خلاف جتنی سخت گیریاں کی گئی ہیں اتنی ملک کی کسی زبان کے کسی شاعر کے خلاف نہیں کی گئیں۔ منیر شکوہ آبادی ہندوستان کا پہلا شاعر تھا جسے آپ کی شاعری کی وجہ سے انڈمان بھیج گیا۔

ہندوستان کی شاید ہی کسی زبان کی شاعری میں یہ بات ملے گی کہ مصرعے، پورا شعر، بند کے بند، نظم کی نظم، غزل کی غزل اور پورے مجموعے، نثر، نظم، کے سو فیصدی ٹھیٹھ الفاظ میں ملتے ہوں۔

اُردو لغت میں ۵۵ ہزار الفاظ ہیں جن میں ۴۰ ہزار ٹھیٹھ ہندی الفاظ ہیں۔ جو بالعموم سنسکرت سے لئے گئے ہیں مگر جن میں ضروری ترمیم کر لی گئی ہے۔ تقریباً پانچسو الفاظ خالص سنسکرت کے ہیں سات ہزار عربی، چھ ہزار فارسی اور تقریباً سوا الفاظ دوسری زبانوں کے ہیں۔ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے اس میں ۴۰ ہزار وہی ہندی زبان کے الفاظ ہیں جو اُردو میں مستعمل ہیں۔ اُردو کے تیرہ ہزار عربی فارسی الفاظ میں سے تقریباً نصف ہندی کے شامل ہیں اور اُردو میں سنسکرت کے پانچسو الفاظ کے بجائے ہندی میں سنسکرت کے پانچ ہزار الفاظ شامل ہیں۔

اُردو اور ہندی کے ۴۰ ہزار مشترک الفاظ ہر آدمی کو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان خواندہ ہو یا ناخواندہ اچھی طرح آتے ہیں۔ وہ انھیں بخوبی سمجھتا بھی ہے اور بولتا بھی ہے۔ اس کے بعد الفاظ کی دوسری بڑی تعداد ان فارسی اور عربی الفاظ کی ہے جن کو

(باقی صفحہ ۵۰ پر ملاحظہ فرمایئے)

نیاز فتحپوری

اردو کا مستقبل

(خطبہ صدارت جو اردو کانفرنس لکھنؤ کے آخری اجلاس میں پڑھا گیا۔)

ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس کا انعقاد ایسے شہر میں ہو رہا ہے جو ادب کے قدیم و جدید دونوں رجحانات کے لحاظ سے اس اجتماع کے لئے بہت موزوں ہے۔ کیونکہ ادب و شاعری کے قدیم رجحان کا آخری مرکز بھی یہی تھا اور جدید میلانات کے پیش نظر ترقی پسند ادب کی بنیاد قائم کرنے میں بھی پہلا قدم یہیں کے خوش فکر نوجوانوں نے اٹھایا۔

ترقی پسند ادب کے آغاز اور اس کے نشو و نما پر بحث و تبصرہ غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آپ میں سے ہر شخص اس سے واقف ہے، لیکن نتیجہ تک پہنچنے اور اس کے مستقبل پر حکم لگانے کے لئے ہم کو یہ حقیقت بار بار دہرانا پڑے گی کہ ترقی پسند ادب کے حامیوں نے باوجود اس محاذ کے جو مذہب و اخلاق اور فن و لسانیات کی طرف سے اس کے خلاف قائم کیا گیا۔ پچھلے دس سال کے اندر صرف اپنے آپ کو اپنی مقررہ شاہراہ پر قائم رکھا، بلکہ رفتہ رفتہ ان خامیوں کو بھی دور کیا جو قدرتاً ہر نئی تحریک میں پائی جاتی ہیں اور اس سے ہم کو اس جماعت کے ادب کا مزاج سمجھنے اور اس کے مستقبل کے ساتھ بلند توقعات قائم کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

ترقی پسند ادب کا ادارہ جن اصول پر وجود میں آیا ہے اس کو اپنی اصطلاح میں وہ "ادب برائے زندگی" کہتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس فقرہ سے ان کا حقیقی مدعا پوری طرح واضح نہیں ہوتا، کیونکہ جس حد تک محض زندگی کا تعلق ہے قدیم ادب سے بھی زندگی کو علیحدہ نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قدیم ادب سے زندگی کا تعلق صرف "لذتیت" تک محدود ہے۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس "لذتیت" کا تعلق زیادہ تر احساسِ الم ہی سے ہے اور اس کی صحت و پاکیزگی کا معیار بھی اس کی وہی داخلیت یا معنویت ہے جس پر "جدید ادب" کی بنیاد قائم ہے۔ بہرحال "زندگی برائے ادب" کی آواز ترقی پسند ادب کے وسیع مقاصد کو دیکھتے ہوئے بہت کمزور سی آواز ہے جو موجودہ ادب کے ماحول اور پس منظر پر بہت دھندلا سا نقش پیش کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے میری رائے میں اس کو "سماجی یا اشتراکی ادب" کہنا زیادہ موزوں ہوگا، کیونکہ قدیم و جدید ادب میں زیادہ تر فرق اسی قسم کا ہے جو فردیت و اجتماعیت میں پایا جاتا ہے۔

ترقی پسندانہ ادبی تحریک کا آغاز ان سیاسی و معاشی الجھنوں سے تعلق رکھتا ہے جو ۱۴ء کی جنگ ختم ہونے کے بعد ہندستان کے طبقۂ عوام میں پیدا ہو گئی تھیں اور اسی لئے اس کا ہدف صرف وہ "فسطائیت" تھی جو سرمایہ دارانہ شقاوت رجعت پسندانہ بے حسی اور سامراجی چالوں کی پیدا کی ہوئی چیز تھی، لیکن یہ احساس ہنوز پختہ نہ ہوا تھا کہ دوسری جنگ شروع ہو گئی۔ گو اس جنگ کی وجہ سے ملک میں کافی انتشار پیدا ہو گیا تھا اور ہمارے ادیبوں کو اپنے مخصوص مرکزِ خیال پر قائم رہ کر کام کرنے میں کافی دشواریاں لاحق ہوئیں۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ جنگ اپنے ساتھ بعض ایسی برکتیں بھی لائی جو شاید امن و سکون کے زمانہ میں ہمیں میسر نہ آتیں، ایک یہ کہ فسطائیت اور سامراجیت کی بنیاد ہمیشہ کے لئے متزلزل ہو گئی اور دوسرے یہ کہ ہم کو اشتراکیت کے سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا زیادہ موقع مل گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں آزادی کا جذبہ زیادہ قوی ہو گیا اور زندگی کے تمام مسائل کو اجتماعیت کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کا ذوق عام ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات سے

ہمارے ادب کو بھی متاثر ہونا تھا۔ اور وہ ہوا۔ چنانچہ ترقی پسند ادب کی بنیاد زیادہ مضبوط ہو گئی اور اس کی مخالفت گھٹ کر صرف فن یا ٹکنیک کی حد تک رہ گئی۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اس دوران میں جدید ادب کی طرف سے جو کچھ پیش کیا گیا وہ سب کا سب قابل توجہ تھا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس کا زیادہ حصہ فنی مہارت اور ذہنی خلوص سے خالی تھا اور بعض لکھنے والے تو محض اپنی نااہلیت چھپانے کے لئے ترقی پسند ادیبوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ اوّل اوّل جب یہ طوفان اٹھا تو بعض حلقوں میں بہت مایوسی کا اظہار کیا گیا، لیکن میں مایوس نہیں تھا اور سمجھتا تھا کہ جنس کاسد از خود ختم ہو کر جنس عیار کے لئے جگہ چھوڑ دیتی ہے اور جب طوفان آتا ہے تو اپنے ساتھ خس و خاشاک بھی لاتا ہے، لیکن یہ گندگی ہمیشہ باقی نہیں رہتی اور یہی ہوا کیونکہ ہماری نوجوان ادیبوں میں بعض اچھے نقاد بھی ابھر آئے۔ انھوں نے جدید ادب کی بہت سی نامطبوع آزادیوں کے خلاف آواز بلند کر کے ادب غیر صالح کی پیداوار میں کافی حد تک کمی کر دی، چنانچہ اب ترقی پسند ادب نے اپنے لئے یقیناً ایک جگہ پیدا کر لی ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہمارے ملک کے بعض نوجوان شاعروں اور ادیبوں نے ادب کے ذریعہ سے عوامی جدوجہد کو کامیاب بنانے میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ترقی پسند ادب اپنا فرض پورا کر چکا اور کیا زندگی کی ہر گھڑی بدلتی رہنے والی قدروں کے متعلق اب اسے کچھ اور نہیں کرنا؟۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کانفرنس کا ایک مقصود اسی مسئلہ پر بھی غور کرنا ہے اور اگر ہم سب مل کر کوئی ایسا لائحہ عمل مرتب کر سکے جو حال کے ساتھ ادب کے مستقبل پر بھی حاوی ہو تو میں اسے بڑی کامیابی سمجھوں گا۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لئے پہلے تین باتوں کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ کیا ہم شعر و ادب کے ذریعہ سے کوئی خدمت ملک و قوم کی کر سکتے ہیں، دوسرے یہ کہ اس خدمت کی نوعیت کیا ہونا چاہئے اور تیسرے یہ کہ ہم عملی حیثیت سے اسے کیونکر کامیاب بنا سکتے ہیں؟

یقیناً ہمارا شعر و ادب یا ہماری قوم کا ذوق ادب اس منزل پر نہیں پہنچا ہے کہ وہ ملک و قوم کی قسمت کا فیصلہ کر سکے۔ لیکن اگر ہمارا شعر و ادب یا قوم کا ذوق ادب انتہائی بلندی تک پہنچ جائے تو ہم صرف ایک شعر سے انقلاب برپا کر سکتے ہیں اور زندہ قوموں کی تاریخ میں ہم کو اس کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں۔ آپ کا وقت تو ضرور ضائع ہوگا، لیکن مجھے اجازت دیجئے کہ میں چند واقعات شعر و ادب کی فسوں کاری کے آپ کو سناؤں۔

عربوں کے عہد جاہلیت اور اوائل اسلام میں مرد عورت دونوں آزادی سے ملتے جلتے تھے۔ محافل و مجالس میں بے تکلف شریک ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ حطیم کعبہ میں بھی دونوں دوش بدوش نظر آتے تھے اور طواف کے وقت بھی ایک کا شانہ دوسرے کے شانہ سے رگڑ کھاتا تھا۔ لیکن آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ عربوں کی یہ صدہا سال کی معاشرت ایک شاعر کے صرف دو شعروں سے ہمیشہ کے لئے آن واحد میں بدل دی۔ سلیمان بن عبدالملک اموی کی خلافت کا زمانہ ہے۔ خالد بن عبداللہ سردار مکہ کی خدمت پر مامور ہیں کہ حج کے زمانہ میں ناگہاں ان کے کانوں تک ایک شاعر کے یہ دو شعر پہونچ جاتے ہیں ؎

یا حبذا الموسم من موقف　　　وحبذا الکعبۃ من مسجد
وحبذا اللاتی یزاحمننا　　　عند استلام الحجر الاسود

یعنی کیسا پیارا ہے یہ موسم۔ کتنی پیاری ہے مسجد کعبہ اور کس قدر پیاری ہیں وہ عورتیں جو سنگ اسود کو بوسہ دیتے وقت ہم کو چار طرف سے گھیر لیتی ہیں۔

خالد نے یہ اشعار سنکر کہا "خیر، اطمینان رکھو اب وہ تمھیں نہیں گھیریں گی" اور حکم دیا کہ مردوں عورتوں میں تفریق کر دی جائے اور سپاہی متعین کر دئے کہ کوڑے مار مار کر دونوں کو علیحدہ کر دیں اور یہ جدائی جو اس وقت قائم ہوئی تھی اب تک باقی ہے۔

ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو۔ ایک غریب عرب کی تین لڑکیاں تھیں جو نہ شکل و صورت رکھتی تھیں نہ کوئی اور خصوصیت

اس لئے انھیں کوئی شوہر نہ ملتا تھا۔ ان لڑکیوں کا باپ جب بہت پریشان ہؤا تو اعشیٰ کے پاس گیا جو اس وقت کا مشہور شاعر تھا۔ اور اسے اپنی داستانِ غم سنائی۔ اعشیٰ بہت متاثر ہؤا اور اسی وقت سوق عکاظ پہونچکر اس نے ان لڑکیوں کی تعریف میں ایک قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہؤا۔ اعشیٰ ابھی پورا قصیدہ ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ تینوں لڑکیوں کو بر مل گئے اور وہیں ان کی شادی ہو گئی۔

اس سے زیادہ ایک دلچسپ واقعہ اور سنئے:۔ عراق کا ایک تاجر مدینہ آتا ہے اور جتنے نقاب اس کے پاس ہیں سب فروخت ہو جاتے ہیں، صرف سیاہ نقاب باقی رہجاتے ہیں۔ لیکن انھیں کوئی نہیں پوچھتا کیونکہ اس وقت وہاں اس رنگ کے نقابوں کا رواج نہ تھا۔ یہ تاجر مسکین الدارمی کے پاس گیا۔ جو بڑا مشہور عیش پرست شاعر تھا، لیکن کچھ عرصے سے تائب ہوکر مسجد میں معتکف ہو گیا تھا۔ مسکین الدارمی نے کہا "میں کیا مدد کر سکتا ہوں" تاجر نے کہا "جس طرح ممکن ہو کوئی تدبیر نکالئے، ورنہ میرا بڑا نقصان ہو جائیگا" مسکین الدارمی نے تھوڑی دیر تامل کیا اور پھر اپنا لباس تقویٰ اتار کر مسجد سے باہر آگیا۔ اور اپنے ایک دوست کو یہ تین شعر یاد کرا کے کہا کہ شہر کے مغنیوں کو جاکر سنا دو ؎

قل للمليحة فی الخمار الاسود ماذا فعلت براهب المتعبد

قد كان شمر للصلوٰة ثيابه حتى خطرت له بباب المسجد

ردی عليه صلوٰته وصيامه لاتقتليه بحق دين محمد

یعنی اس معشوقۂ ملیح رنگ سے جو سیاہ نقاب ڈالے ہوئے ہے کوئی جاکر کہدے کہ یہ تو نے ایک فقیر گوشہ نشین کا کیا حال کر دیا۔ وہ تو اپنا دامن سمیٹ کر ایک مسجد کے کونہ میں بیٹھ رہا تھا مگر تو دفعتًا سامنے آگئی اور نماز روزہ سب ترک کرا دیا، پھر اے حسینہ تجھے واسطہ دین محمد کا کہیں ایسا نہ کرنا کہ تو اسے ہلاک کر دے۔

جس وقت یہ اشعار مدینہ کی گلیوں میں پہنچے تو سب کو یقین ہو گیا کہ دارمی واقعی کسی سیاہ نقاب والی پر عاشق ہو گیا ہے اور مدینہ کی کوئی ملیح رنگ لڑکی ایسی نہ رہی جس نے اس تاجر سے سیاہ نقاب خرید کر اپنے چہرے پر نہ ڈال لیا ہو۔ اس کے بعد سیاہ نقاب وہاں کے فیشن میں داخل ہو گیا جو اب تک رائج ہے۔

ہشام بن عبدالملک کی خلافت کا زمانہ ہے اور خالد القسری عراق و خراسان کا گورنر ہے۔ اس وقت تک عام دستور تھا کہ مسجد کے منارے بہت بلند ہوتے تھے اور ان پر کھڑے ہو کر موذن اذان دیا کرتے تھے۔ اتفاق سے ایک دن خالد کے کانوں تک کسی شاعر کے یہ اشعار پہنچ گئے ؎

ليتنی فی الموذنين حياتی انهم يبصرون من فی السطوح

فيشيرون او نشير اليهم بالهوى كل ذات دل مليح

یعنی کاش میں بھی موذنوں میں سے ہوتا جو اونچے اونچے مناروں پر کھڑے ہو کر اذان دیتے وقت آس پاس کی چھتوں پر نگاہ ڈالتے ہیں اور وہیں سے عشوہ طراز ملیح لڑکیوں سے اشارہ بازیاں ہوتی ہیں ——— آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ خالد نے ان اشعار کے سنتے ہی حکم دیدیا کہ مساجد کے تمام منارے منہدم کرا دیئے جائیں اور وہ ایک ہی دن میں منہدم ہو گئے۔

نصر بن سامانی ایک بار موسم بہار میں ہرات گیا اور وہاں کا موسم اسے اس قدر پسند آیا کہ کامل چار سال تک برابر وہیں پڑا رہا اور امراء اور فوج کے لوگ تنگ آگئے، لیکن بادشاہ سے کہنے کی کسی میں ہمت نہ تھی، مجبورًا رودکی کے پاس گئے اور کہا کہ اگر تم کسی تدبیر سے بادشاہ کو بخارا واپس لے گئے تو پانچہزار اشرفیاں تمھاری خدمت میں پیش کی جائیں گی۔

دوسرے دن رودکی دربار میں گیا اور ساز کے ساتھ اپنا وہ مشہور قصیدہ پڑھنے لگا جس کا پہلا شعر ہے ؎

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی ‏ ‏ ‏ یادِ یارِ مہرباں آید ہمی

اس کے بعد جب رودکی نے یہ اشعار پڑھے ؎

اے بخارا شاد باش و شاد زی ‏ ‏ ‏ شاہ سویت میہماں آید ہمی

شاہ ماہ ست و بخارا آسماں ‏ ‏ ‏ ماہ سوی آسماں آید ہمی

تو نصر اس قدر بیتاب ہو گیا کہ اُسی وقت گھوڑا طلب کیا اور سوار ہو کر بخارا روانہ ہو گیا۔

یہ اور اس قسم کے بہت سے واقعات ہم کو تاریخ میں ملتے ہیں جن سے شاعری کی قوت کا پتہ چلتا ہے اور اگر کسی قوم میں ایسے شاعروں کا فقدان ہے تو اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کی شاعری خلوص اور صداقت سے خالی ہے۔ یعنی ان کے جذبات خود اُن کے جذبات نہیں ہیں بلکہ مستعار ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ اُنھوں نے زمانہ اور وقت کا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن جب کبھی یہ دونوں باتیں جمع ہو گئیں تو اُنھوں نے ہمیشہ بجلی کا سا کام کیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ سوویٹ ادب پر نگاہ ڈالیں گے تو معلوم ہو گا کہ وہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے وہاں کا قومی کردار بنانے اور جنگ جیتنے میں کتنا نمایاں حصہ لیا۔

انھیں کی کتابیں تھیں جو سوویٹ افواج کو اسٹالن گراڈ سے برلن تک لے گئیں اور انھیں کی نظمیں تھیں جو سوویٹ سپاہیوں کے خون میں طوفان کا سا جوش و خروش پیدا کر دیتی تھیں۔

یہ میخائیل شولوخوف ہی تھا جس نے ایک کتاب "سائنس نفرت" لکھ کر سب سے پہلے فاشزم کی پردہ دری کی اور یہ آرکودسکی، جمبول جابر، اور یعقوب کولاس ہی کی نظمیں تھیں جنھوں نے سوویٹ عوام کو خود اعتمادی کی دولت بخشی۔
جنھوں نے سوویٹ ادب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہاں کے شاعروں اور ادیبوں نے ملک و قوم کو تازہ زندگی بخشنے میں کتنا بڑا حصہ لیا اور اگر ہم بھی اپنے ادب کا یہی مقصد قرار دیں تو ہماری قوم بھی اس سے وہی فائدہ حاصل کر سکتی ہے جو سوویٹ یونین کی آبادی نے حاصل کیا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اپنی قوائے ادب سے کام لینے کے لئے اس سے زیادہ موزوں وقت کوئی نہیں ہو سکتا۔

ایک بار پروفیسر رشید احمد صدیقی سے دوران گفتگو میں نے پوچھا کہ ہمارے یہاں وکٹر ہیوگو کا سا ادیب کیوں پیدا نہیں ہوتا۔ اُنھوں نے کہا کہ ادب کی تخلیق اور اس کا رخ متعین کرنے کے لئے ضروری چیز اس کا پس منظر اور ماحول ہے۔ وکٹر ہیوگو کو یہ پس منظر انقلاب فرانس ایسے اہم واقعہ کی صورت میں ہاتھ آیا اور یہاں کوئی اتنا زبردست محرک موجود نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دوران جنگ میں بلکہ اس سے قبل ہی ہمارے شاعروں اور ادیبوں کے سامنے ملک کی معاشی زبوں حالی، سرمایہ دارانہ تشدد، سامراجی گرفت اور رجعت پسندانہ ذہنیت ایک اچھا پس منظر تھا اور انھوں نے اس کا فائدہ بھی اُٹھایا لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہمارے یہاں وکٹر ہیوگو پیدا نہ ہو سکا۔ اس کا سبب ہو سکتا ہے یہ ہو کہ ملک کے حالات شاید زیادہ محرک نہ تھے، لیکن اس وقت ہندستان جس دور سے گزر رہا ہے وہ انقلاب فرانس سے کم اہم نہیں اور اس زمانہ کی ادبی پیداوار میں یقیناً زیادہ خلوص، زیادہ جوش اور زیادہ واقعیت ہونا چاہئے۔

اس جنگ میں فاسستی قوتوں کے زوال کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی متحقق ہو چکا تھا کہ ہندستان کا دور غلامی ختم ہو کر رہیگا اور ایسا ہی ہوا۔ لیکن اس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ آزادی کی اتنی گراں قیمت ادا کرنا پڑیگی۔ توقع تو یہ کیجاتی تھی کہ حصول آزادی کے بعد یہاں کی تمام قومیں ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائینگی اور ملک کی ترقی میں برابر کا حصہ لیں گی۔ لیکن افسوس ہے کہ تقسیم ہند نے اس توقع کو پورا نہ ہونے دیا اور ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں جو صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ ل جل کر

زندگی بسر کر رہی تھیں، نفرت و عناد کی دیوار حائل کر دی۔

اس تصادم سے جو خراب نتائج پیدا ہوئے ان میں ایک وہ بھی ہے جو قومی زبان سے تعلق رکھتا ہے اور جس نے اُردو اور ہندستانی دونوں کو پس پشت ڈال دیا۔ ہندستان کی قومی زبان کا سوال عرصہ سے زیر بحث تھا۔ لیکن مہاتما گاندھی اور دیگر اکابر ملک نے، ہندی اُردو نزاع دور کرنے کی ایک نہایت معقول صورت یہ تجویز کی تھی کہ سنسکرت اور عربی فارسی الفاظ دونوں کو کم کر کے عام بول چال کو قومی زبان تصور کیا جائے اور اس کا نام اُنھوں نے ہندستانی رکھا جو اُردو اور ناگری دونوں رسم خط میں لکھی جا سکتی ہے۔ اس تجویز کو ہندو مسلمان دونوں جماعتوں نے تسلیم کر لیا۔ اور اسی وقت سے اُردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ چنانچہ پچھلے چند سال میں اُردو کی جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ زبان کے معاملہ میں پچیس سال قبل کی کتابوں سے بہت مختلف ہیں۔ نظم و نثر دونوں میں عام بول چال کے سادہ الفاظ زیادہ استعمال کئے جانے لگے۔ جلسوں اور کانفرنسوں میں اُردو کے ادیبوں کی طرف سے ہمیشہ عام فہم زبان استعمال کرنے پر زور دیا گیا۔ یہاں تک کہ اُردو کے بعض قدامت پرست ادیبوں اور شاعروں نے بھی اپنی قدیم روش ترک کر دی۔ ہندو ادیبوں نے اس تجویز پر کس حد تک عمل کیا، اس کا مجھے علم نہیں، لیکن اس زمانہ کی کویتا کے جو نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ شاید ایک حد تک اُنھوں نے بھی اس کا لحاظ رکھا ہے۔ بہر حال ہندوستانی کو قومی زبان کی حیثیت دینے کا فیصلہ بہت مناسب فیصلہ تھا اور اس پر ہندو مسلمان دونوں متفق ہو سکتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ تقسیم ہند کے ساتھ ہی اس کی تنسیخ بھی کر دی گئی اور اُردو کا تو خیر ذکر ہی کیا ہے، ہندوستانی کو بھی اجنبی زبان قرار دیکر یو۔پی کی حکومت نے سنسکرت آمیز ہندی کو ناگری رسم خط کی پابندی کے ساتھ صوبہ کی زبان قرار دیدیا اور اس کی تقلید میں دوسرے صوبے بھی یہی کر رہے ہیں، یہاں تک کہ مشرقی پنجاب میں بھی یہی حکم نافذ کر دیا گیا، حالانکہ وہاں ہندوؤں کی اسّی فیصدی آبادی بھی ہندی زبان اور ناگری رسم خط سے ناواقف ہے۔

اس سلسلہ میں ہندوؤں کی طرف سے جو تاویلیں پیش کی جاتی ہیں وہ بہت عجیب و غریب ہیں اور ان کا نمونہ آپ کو یو۔پی کے وزیر تعلیمات کے اس مضمون میں ملیگا جو ۱۰ر نومبر کے نیشنل ہیرالڈ میں شائع ہوا ہے۔ اُنھوں نے اس میں ظاہر کیا ہے کہ اُردو غیر قومی زبان ہے۔ اس لئے قومی حکومت میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں اور ہندوستانی علمی زبان بننے کی اہلیت نہیں رکھتی اس لئے وہ ہماری ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ انھوں نے اپنے ان دعووں کے ثبوت میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تفصیل کا موقع نہیں اور نہ چنداں ضرورت کیونکہ اس کے جواب میں ہمارے عزیز دوست پروفیسر آل احمد سرور کا ایک نہایت معقول و مدلّل مضمون شائع ہو چکا ہے۔ لیکن میں اس جگہ سمپورنا نند جی کے ایک منطقی مغالطہ کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا وہ یہ کہ اُردو کو وہ غیر قومی زبان کہتے ہیں اور ہندوستانی کو غیر علمی، لیکن ہندستانی کے قومی زبان ہونے کی حیثیت و اہلیت کا وہ اس میں ذکر ہی نہیں کرتے۔

یقیناً ہر لٹریچر میں علمی زبان، عام بول چال سے علیحدہ ہوتی ہے اور اگر ہندو ہندی یا سنسکرت میں علمی تصانیف کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے کریں، لیکن عوام کی زبان کو وہ سنسکرت کیونکر بنا سکتے ہیں۔

اگر اُردو عوام کی زبان نہیں ہو سکتی تو سنسکرت بدرجۂ اولیٰ نہیں ہو سکتی، کیونکہ اُردو یا عربی فارسی کے تو بہت سے الفاظ بگڑی ہوئی صورت میں جنتا کی زبان پر رائج ہیں، لیکن سنسکرت کے نہیں اور اگر ہیں بھی تو اس حد تک کہ ان کی ماہیت بالکل بدل گئی ہے۔ اب سے ۲۶ سال قبل کی بات ہے۔ جب سنہ ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ "صرف ہندوستانی جو دیوناگری اور اُردو دونوں رسم خط میں لکھی جائے کانگریس کی سرکاری زبان ہوگی" اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں ورکنگ کمیٹی نے اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے ظاہر کیا تھا "وہ زبان جو شمالی ہند کے عام باشندوں کی زبان ہے اور ناگری یا اُردو رسم خط میں لکھی جاتی ہے، وہی ہماری قومی زبان ہے اور اسی کا نام ہندستانی ہے"

ڈاکٹر تاراچند اور پنڈت سندرلال نے حال ہی میں اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "عام جنتا کے لئے سنسکرت ملی ہوئی ہندی یا عربی فارسی ملی ہوئی اردو کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ جنتا کی ترقی اور اصلاح اس وقت ممکن ہے، جب آسان زبان استعمال کی جائے۔ اگر صرف ناگری رسم خط کو اختیار کیا گیا تو ہندستانی میں سنسکرت الفاظ کا شامل ہو جانا ضروری ہے اور اگر صرف اردو رسم خط اختیار کیا گیا تو عربی فارسی الفاظ کی کثرت سے بچنا مشکل ہوگا۔ اس لئے بہترین صورت یہ ہے کہ ہم دونوں رسم خط کو قائم رکھیں تاکہ کچھ زمانہ کے بعد ہندی اور اردو سے ملکر ایک نئی زبان بن سکے اور یہی وہ زبان ہوگی جسے ہم ہندستانی کہہ سکیں گے۔"

حال ہی میں جب یو۔پی کی حکومت نے ناگری رسم خط اور ہندی زبان کو سرکاری زبان اور رسم خط تسلیم کرایا۔ تو مہاتما گاندھی نے اس کی مخالفت کی اور فرمایا کہ "مجھے اس حکم سے بڑا دکھ پہنچا ہے۔ کیونکہ مساویانہ سلوک یہ چاہتا تھا کہ اردو رسم خط کا بھی احترام کیا جائے حیرت ہے کہ ایک طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو ہندستان سے نکالنا نہیں چاہتے اور دوسری طرف ایسی باتیں اختیار کی جا رہی ہیں کہ مسلمان اپنی زندگی یہاں عزت و اطمینان کے ساتھ بسر نہیں کر سکتے" ہمارے صوبہ کی گورنر مسز سروجنی نائیڈو بھی حکومت یو۔پی کی پالیسی کو پسند نہیں کرتیں۔ لیکن پھر بھی یو۔پی گورنمنٹ نے ۸ راکتوبر ۴۷ء کو حکومت کی زبان ہندی اور رسم خط دیوناگری مقرر کر ہی دیا۔ اور تمام دفتروں، عدالتوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس پر عمل کریں۔ سرکاری نوکری کے لئے ہندی کا جاننا ضروری شرط قرار دیا گیا۔ اور موجودہ ملازمین کو بھی حکم دیدیا گیا کہ وہ ہندی سیکھنا شروع کر دیں اور تین ماہ کے بعد تمام افسران کے کام کا جائزہ لیکر دیکھا جائیگا کہ انھوں نے ہندی میں کتنی مہارت حاصل کر لی ہے۔ یکم دسمبر ۴۷ء سے تمام فارم ہندی میں چھپ رہے ہیں۔ اور ابتدائی مدارس میں آٹھویں درجہ تک ہندی کی تعلیم لازمی ہو گئی ہے۔

ہندی کی جو تعریف گورنمنٹ آرڈر میں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ "ہندی شبد کے پریوگ ابھی پراسے اُس بھاشا سے ہے جو سنجکت پرانت کی جنتا کی بھاشا ہے اور جو دیوناگری لپی میں لکھی جاتی ہے" یعنی ہندی زبان وہ ہے جسے عام لوگ سمجھ سکیں۔ لیکن اُس کی تعریف جس زبان میں کی گئی ہے خیر سے اسے بھی جنتا نہیں سمجھ سکتی۔ دفتری اور عدالتی زبان کو کیا سمجھ سکے گی۔

یقیناً حکومت کی زبان وہی ہونا چاہئے جسے جنتا سمجھ سکے اور اس لئے ان تمام الفاظ کو بدستور قائم رکھنا چاہئے جو رواج پا گئے ہیں خواہ وہ کسی زبان کے ہوں۔ لیکن اس کا مطلق لحاظ نہیں کیا گیا اور تمام مروجہ الفاظ کی جگہ نہایت ثقیل الفاظ سنسکرت کے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس وقت جنتا کی زبان پر نہ صرف عربی فارسی بلکہ انگریزی کے بھی بہت سے الفاظ چڑھے ہوئے ہیں اور وہ ان کے مفہوم سے بخوبی واقف ہے۔ اس لئے اُن کے بدل دینے سے جو زحمت پیدا ہوگی اس کا اندازہ حکومت آج نہیں تو کل کرے گی۔

اوّل اوّل جب ۳۷ء میں کانگرس کی پہلی وزارت قائم ہوئی تھی تو اُس وقت بھی اسمبلی کے اجلاسوں میں بعض ممبران نے سنسکرت آمیز ہندی بولنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ مگر اب تقسیم ہند کے بعد چونکہ حالات بدل گئے ہیں اور اس کا امکان باقی نہیں رہا کہ انگریز پھر لوٹ آئیں گے یا مسلمان کوئی مؤثر قدم اس کے خلاف اُٹھا سکیں گے۔ اس لئے زیادہ قوت و تنظیم کے ساتھ اُردو اور ہندستانی دونوں کو مٹایا جا رہا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہندو اُردو زبان سے اس قدر متنفر نہیں ہیں جس قدر اُردو رسم خط سے، اور اُردو رسم خط مٹانے کی کامیاب صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اُردو زبان ہی کو غیر قومی زبان قرار دیا جائے۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ موجودہ حکومت ایک طرف دو قومی نظریہ کی بھی مخالف ہے اور دوسری طرف وہ ہندی زبان اور ہندی رسم خط کو بھی لازم قرار دیتی ہے۔ جو کھلی ہوئی دو قومی نظریہ کی تائید ہے۔

ہندوستان کی تقسیم پر ہندوؤں کی تمام جماعتوں نے اظہار افسوس کیا، لیکن اس سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ وہ اپنے طرز عمل سے اس تفریق و تقسیم کو اور زیادہ مستحکم بنا رہے ہیں اور اگر آئندہ کوئی امید دونوں حکومتوں کے دوبارہ متحد ہونے کی قائم بھی ہو سکتی تھی تو وہ اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو رہی ہے۔ زبان اور رسم خط کا بہترین حل اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہی جو مہاتما گاندھی نے

تجویز کیا ہے۔ یعنی ہندوستانی کو قومی زبان قرار دیکر اسی کو زیادہ وسیع بنایا جائے اور رسم خط دونوں قائم رکھے جائیں، جیساکہ اس سے قبل پایا جاتا تھا، لیکن ہندوستان کی حکومت نے تقسیم ہند سے قبل ہی آل انڈیا ریڈیو کی مدد سے اُردو اور ہندوستانی دونوں کے لئے قبر کھودنا شروع کر دی تھی اور اب تقسیم ہند کے بعد تو انھوں نے اُردو کو اپنے خیال میں گویا دفن ہی کر دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ زبان کے باب میں ہندوؤں کی موجودہ ذہنیت کا بڑا تعلق ملک کی سیاسیات سے ہے اگر ہندوستان میں فرقہ وارانہ تحریک اس قدر ترقی نہ کرتی کہ اس کا نتیجہ تقسیم ملک کی صورت میں ظاہر ہوتا تو ہندوؤں کی ذہنیت میں یہ ردّعمل پیدا نہ ہوتا لیکن افسوس ہے کہ ہندوؤں نے بھی اس مسئلہ میں کسی بلند نظری کا ثبوت نہیں دیا۔ اور اگر مسلمانوں کی ایک جماعت نے دو قومی نظریہ قائم کرنے کی غلطی کی تھی تو ہندوؤں نے اس نظریہ کو تسلیم کر کے اس سے کم غلطی نہیں کی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں کے دل و دماغ اس وقت جذبۂ انتقام سے ماؤف ہیں اور اسی جذبہ کی شدت نے ان کو اس حد تک متاثر کر رکھا ہے کہ وہ اُردو کے ساتھ خود ہندی کو بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ممکن ہے وہ اس وقت حکومت کی مدد سے اپنی زبان میں سنسکرت کے بعض ثقیل و غیر مانوس الفاظ شامل کرنے میں کامیاب ہو جائیں، لیکن وہ اس طرح نہ سنسکرت کو دوبارہ زندہ کر سکتے ہیں اور نہ جنتا ان کی اس نئی بانی کو زیادہ عرصہ تک گوارا کر سکتی ہے۔ زبانیں نہ تیغ و تفنگ سے بنتی ہیں، نہ عصبیت و تنگ نظری سے بلکہ وہ آپس کی میل جول سے وجود میں آتی ہیں اور صرف اس حد تک ترقی کر سکتی ہیں جس حد تک انسانی تمدن کی ضروریات ان سے پوری ہوں چنانچہ یہی وجہ تھی کہ دنیا کی دوسری قدیم زبانوں کی طرح سنسکرت بھی مٹ کر رہی اور اگر آج سریانی و عبرانی کو دوبارہ زندہ کرنا ممکن نہیں تو سنسکرت بھی یقیناً حشر سے بے نیاز ہے۔ ہمارے ملک کی زبان جسے ہم ہندوستانی کہتے ہیں وہ ہندو مسلمان دونوں کی ملکیت ہے اور اس کو موجودہ منزل تک پہنچانے میں مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کے دوش بدوش کوششیں کی ہیں۔ ہندی ادب اور شاعری میں مسلمانوں کی خدمات ممکن ہے آج ہندوؤں کے پیش نظر نہ ہوں۔ لیکن صفحاتِ تاریخ سے انھیں محو نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں عام طور پر صرف امیر خسرو، ملک محمد جائسی اور خانخاناں ہی کا نام لیا جاتا ہے حالانکہ مسلمانوں میں سیکڑوں نامور شعراء اور ادیب ایسے گذرے ہیں جنھوں نے ہندی ادب کی آبیاری میں نمایاں حصہ لیا اور زبان کی حیثیت سے سند قرار دیئے گئے۔ یہ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ہندی کی سب سے پہلی مثنوی مرگاوتی ایک مسلمان ہی نے لکھی تھی جن کا نام قطبی شیخ تھا اور جو شیر شاہ سوری کے والد حسین شاہ کے یہاں رہتے تھے۔ ہندی کا ایک مشہور دوہا ہے:-

امے ہلاہل ـــــ مدھ بھرے سویت شام رتنار
جیت مرت جھک جھک پرت جہہ چتوت اک بار

آپ ہندوؤں سے پوچھئے کہ یہ کس کا دوہا ہے تو وہ سب کے سب اس کو بہاری لال کی تصنیف بتائیں گے، حالانکہ یہ سید غلام نبی بلگرامی کی تصنیف ہے۔ اسی طرح رجب شاہ کی ساکھی گرنتھ، حسین کی کالیداس ہزارا، اعظم خاں کی سنگار درپن طالب علی بلگرامی کی دیپک پریا، نواز اللہ بلگرامی کی سار چندرکا، کاظم علی کی سنا سن تجیسی، سید پہاڑ کی رس ستار، قاسم شاہ کی ہنس جواہر، حاجی کا پریم نامہ، منشی خیراتی خاں کی دیوری ساگر اور اسی طرح کی سیکڑوں ہندی تصانیف مسلمانوں ہی کے قلم سے نکلی ہیں ـــــ پھر کیا اس سے زیادہ حق تلفی مسلمانوں کی کوئی اور ہو سکتی ہے کہ آج جب ہندو جماعت زبان کا مسئلہ طے کرنے بیٹھتی ہے تو وہ مسلمانوں کی ان عظیم خدمات کا مطلق لحاظ نہیں کرتی۔ یقیناً ہندوستان کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے ہمیں بھی انھیں کے برابر حق حاصل ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آج نہیں تو کل انھیں ہمارے اس حق کے تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑیگا۔ تاہم بحالات موجودہ زبان کا مسئلہ بہت غور طلب ہے اور تمام اُردو داں طبقہ اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کو سوچنا ہے کہ ان کا طرز عمل اب کیا ہونا چاہئے۔ میں اس کا تو مؤید ہوں کہ مسلمانوں کو ہندی زبان سیکھنا چاہئے،

کیونکہ اس طرح وہ ہندستانی زبان کی ترویج میں کہیں زیادہ کامیاب ہو سکیں گے اور خود اردو کو بھی اس سے کافی مدد ملیگی، لیکن میں اس کے خلاف ہوں کہ وہ حکومت کی اس پالیسی کے سامنے محض اس لئے سرِ تسلیم خم کر دیں کہ وہ اقلیت میں ہیں یا یہ کہ ہندی سیکھنے کے بعد وہ کوئی خاص رعایت حکومت کی طرف سے حاصل کر سکیں گے۔ نوکری کا اس وقت مسلمانوں کے سامنے کوئی سوال نہیں ہے، کیونکہ کہنے کو تو ۳۰ فیصدی کا تناسب ان کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ لیکن عملاً اس سے نصف جگہیں بھی انھیں نہ ملیں گی اس لئے مسلمانوں کا اپنے بچوں کو اب اسکولوں اور کالجوں میں اس غرض کے لئے بھیجنا کہ حکومت انھیں نوکریاں دیگی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہاں اگر علم کی تحصیل محض علم کی غرض سے مقصود ہو تو حکومت کی تعلیم گاہوں سے فائدہ اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اسی کے ساتھ ان کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اپنے کلچر اور اپنی زبان کے تحفظ کے لئے حکومت سے بالکل بے نیاز ہو کر انھیں خود اپنے علمی ادارے قائم کرنا پڑیں گے۔ کیونکہ ہماری زبان ہماری ملکیت ہے اور ہمیں اس کے بقا و تحفظ کے ذمہ دار ہیں اگر اردو زبان یا اردو رسم خط صرف مسلمانوں ہی کی چیز سمجھی جاتی ہے (حالانکہ ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے) تو ہمیں اس چیلنج کو منظور کر لینا چاہئے ——— اردو کروڑوں انسانوں کی ملکیت ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں اور جب تک ان کا وجود باقی ہے کوئی طاقت ان کی اس عزیز ملکیت کو ان سے نہیں چھین سکتی۔)

میں اس کا مخالف نہیں ہوں کہ حکومت کے اس نامناسب فیصلہ کے خلاف احتجاج نہ کیا جائے، ضرور کیجئے اور جتنے عقلی، روایتی، تاریخی اور اخلاقی دلائل ہو سکتے ہیں ان سب سے کام لیکر حکومت پر اس کی غلطی، تنگ نظری اور عصبیت کو ثابت کر دیجئے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سطے کر لیجئے کہ اگر حکومت نے آپ کی نہ سنی اور یہ یقین ہے، کیونکہ اس باب میں وہ اتنا آگے بڑھ گئی ہے کہ واپس آنا اس کے لئے بھی مشکل ہے، تو پھر آپ کیا کریں گے۔ یہ ہماری انتہائی پست ہمتی ہوگی اگر ہم یہ سمجھ کر حکومت کو متوجہ کریں کہ بغیر اس کی مدد کے ہماری زبان باقی نہیں رہ سکتی اور ہم محض اس لئے ہمت ہار بیٹھیں کہ حکومت ہمارا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ زبان کا مسئلہ ہماری قومی خصوصیات کا مسئلہ ہے اور ایک قوم ہی پر اس کے بقا و تحفظ کی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔

اس سے قبل جب حیدرآباد میں پہلی اردو کانفرنس ہوئی تھی اُس وقت چند تجاویز پاس کی گئی تھیں، لیکن مجھے علم نہیں کہ ان پر کوئی عمل کیا گیا یا نہیں، لیکن یہ اُسوقت کی بات ہے جب ہندستان کے دو ٹکڑے نہ ہوئے تھے، اور جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت تھی وہاں بھی وہ کافی وزن رکھتے تھے اور مشکل سے حکومتوں کو جرأت ہو سکتی تھی کہ وہ اردو زبان اور اردو رسم خط کو فنا کر دیں۔ لیکن اب حالات بالکل بدل گئے ہیں اور ہمیں پر سارا بار اپنی زبان کی حفاظت کا پڑ گیا ہے۔ اس لئے سخت ضرورت ہے کہ ہم اب کوئی موثر عملی قدم اٹھائیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ عملی قدم کیا ہو سکتا ہے۔

اس باب میں، ہمارے سامنے ایک نمونہ سوویٹ شاعروں اور نغمہ نگاروں کی انجمن کا موجود ہے اور نامناسب نہ ہوگا اگر میں اس کے نظامِ عمل پر اس وقت کچھ روشنی ڈالوں جو حال ہی میں اس انجمن کے انتظامیہ سکریٹری نے شائع کیا ہے۔ اس انجمن کا تعلق حکومت سے بالکل نہیں ہے، بلکہ یہ ایک رضاکارانہ جماعت ہے جس کی شاخیں ملک کے ہر حصہ میں قائم ہیں۔ اس انجمن میں اس وقت ایک ہزار سے زیادہ شعراء اور نغمہ نگار شامل ہیں۔ اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ شاعروں، نغمہ نگاروں اور تنقید نگاروں میں باہم تبادلۂ خیالات کے مواقع مہیا کر کے فن کی تخلیقی قوتوں کو ترقی دینے اور ان کو کارآمد بنانے کے لئے سہولتیں فراہم کرے۔ ہر نوخیز و پختہ کار فن کار اس کا ممبر ہو سکتا ہے، اور ہر ممبر کو اپنی تخلیقی انفرادیت کو نشو و نما دینے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ نوخیز و نومشق فنکاروں کو بے لگام ہونے سے بھی بچایا جاتا ہے، اور وہ اس طرح کہ ہر مصنف اپنی تصنیف کو انجمن کے سامنے پیش کرتا ہے جس پر سخت تنقید ہوتی ہے اور مصنف کو مفید مشورے دیئے جاتے ہیں۔

اس ادارے کے کسی ممبر کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی تصنیف کی اشاعت کے لئے کسی سرمایہ دار کی تلاش کرے

بلکہ انجمن خود معاوضہ دیتی ہے۔ اشاعت کے تمام مصارف برداشت کرتی ہے۔

اس انجمن کی سرگرمیوں کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ وہ مختلف الخیال مصنفوں کے درمیان رابطہ و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے، اور اس مقصد کے پیش نظر جب مصنفین اپنی اپنی تصانیف کو لیکر ماسکو آتے ہیں تو ان کو انجمن سنتی ہے اور نئے شاعروں، اور ادیبوں کی تربیت و اصلاح کی تدبیریں سوچی جاتی ہیں۔

اس انجمن کے صدر دفتر کے لئے ایک آٹھ منزل کی عمارت تیار کی گئی ہے، جس میں ایک کلب بھی شامل ہے اور جس کا ایک حصہ فن کاروں کے قیام کے لئے بھی مخصوص ہے۔

چار سال ہوئے کہ حکومت نے ایوانوف کے علاقہ میں ایک قطعۂ زمین دیا تھا جو اپنی آب و ہوا اور خوبصورتی کے لحاظ سے بہت مشہور ہے۔ انجمن کا ہر رکن جب چاہے یہاں کی پُرسکون فضا میں آرام کرنے اور تصنیفی کام کرنے کے لئے جا سکتا ہے۔ اور مصنفین کی مالی ضروریات پورا کرنے کے لئے وہاں ایک بڑا فنڈ قائم ہے جس سے مصنفین کو پیشگی معاوضہ ملتا ہے، اور جب کوئی تصنیف شائع ہوتی ہے تو حق اشاعت علیحدہ دیا جاتا ہے۔

اسی فنڈ سے مصنفین کے لئے صحت گاہیں بھی قائم کی گئی ہیں اور اسی فنڈ سے ان کے بچوں کے لئے تربیت گاہیں بھی بنائی گئی ہیں، اور آپ کو یہ سنکر غالباً تعجب ہوگا کہ صرف چار سال کے اندر اس انجمن نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ پچھلے سال اس کا بجٹ ایک کرور ۲۰ لاکھ روبل کا تھا۔

ہر چند میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لئے بالکل اسی اصول پر کوئی عملی قدم اٹھانا ــــ بحالات موجودہ مشکل ہے۔ لیکن اگر اس خاکے کو سامنے رکھکر کسی بڑے پیمانے پر نہ سہی چھوٹے ہی پیمانے پر فی الحال کوئی ایسی انجمن قائم ہو سکیں تو میں اس کو بھی بڑی کامیابی سمجھوں گا۔

میں سمجھتا ہوں میں نے آپ کا کافی وقت ضائع کیا اور پھر بھی بہت سی باتیں جو کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا اس لئے اب اپنا خطبہ ختم کرتا ہوں اور آخر میں ملک کے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کو ایک بار پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان کی ذہنی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہئے اور "ادب برائے زندگی" کا صحیح مفہوم کیا ہے اور اس سلسلے میں مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا ہے جو میکسم گورکی نے سوویٹ مصنفین کی پہلی کانفرنس میں کہا تھا کہ :-

> "اشتراکی ادب کی حقیقت پسندی، زندگی کی بڑی مہم ہے ــ ایک ایسی تخلیقی جدوجہد ہے جس کا مقصد انسان کی بہترین انفرادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے تاکہ وہ قواء عالم پر قابو پاکر اپنی صحت کو برقرار اور زندگی کو طویل بنا سکے اور اس دنیا کو اپنی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر ایک خوبصورت مسکن بنا سکے جس میں تمام نوع انسانی ایک خاندان کی حیثیت رکھتی ہو"

بقیہ اردو شاعری

ہندی یا نسبتاً ٹھیٹ ہندی ہر آدمی بولتا اور سمجھتا ہو۔ ہندی اور اُردو کی کہہ دیتیں، محاورات اور الفاظ بھی مشترک ہیں۔

اُردو کے تیرہ ہزار عربی فارسی الفاظ میں سے اندازاً پانچ ہزار الفاظ کسی کو سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر ان پڑھ ہندوستانی دو ہزار الفاظ اور جان جائے تو اس پر اُردو کا خزانہ کھل جائیگا۔ مجھ کو تو یاد ہی نہیں پڑتا کہ اُردو کا کوئی اہم لفظ مجھ کو محنت کر کے یاد کرنا پڑا ہو۔ اور پھر شاعری ان الفاظ سے ہو ہی نہیں سکتی جنھیں تکلف کے ساتھ سیکھا اور استعمال کیا جائے۔

ہماری اُردو شاعری بڑی معصوم، فطری اور جمہوری چیز ہے۔ شاعری اس وقت ہوتی ہے جب زبان اپنے آپ کو پالے۔ شاعری کی زبان معصومی اور نرمی کی زبان ہے۔

ممتاز حسین

کلچر اور فرقہ پرستی

میں کلچر کے لفظ کو اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ دراصل اس کا جو مقصود ہے اس کا ہم معنی لفظ اردو زبان میں نہیں ہے۔ ثقافت کے لفظ کو اب اردو زبان میں استعمال کیا جا رہا ہے لیکن یہ ایسا کچھ غیر مانوس لفظ ہے کہ اس سے ذہن میں کوئی تصویر ابھرتی ہی نہیں۔ مجبوراً تہذیب اور تمدن کے لفظوں کی طرف تاکنا پڑتا ہے۔ آپ ایک ملک، ایک شہر اور قریے کو متمدن کہتے ہیں لیکن ایک شخص کو صرف مہذب کہتے ہیں۔ اور یہ کہہ کر آپ یہ مراد لیتے ہیں کہ اس کی فطرت میں کچھ ایسی لچک اور نرمی ہے اور اس کے اطوار میں کچھ ایسا حسن اور سلیقہ ہے جو اسے غیر مہذب آدمیوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ اگر اس کی یہ لچک، فطرت اور اطوار کسی شعور یا تنظیم عقل کے لازمی نتائج ہیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ کچھ شعوری طاقتیں ایسی ہیں جو انسان کی فطرت کو بدلتی رہتی ہیں۔ اس تبدیلی کے یہ بھی معنی ہیں کہ ہم اپنے قدیم ذہنی تصورات اور جذباتی تعصبات سے بھی جنگ کرتے رہتے ہیں۔ کلچر اسی تبدیلی کا نام ہے۔ اب میں اسی چیز کو فلسفیانہ نہج سے رکھنا چاہتا ہوں۔ انسانی شعور دو طرح ہماری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک تو خارجی حیثیت سے اور دوسرے داخلی حیثیت سے۔ پہلی بات تو یہ کہ شعور اپنے وجود کے لئے صرف مادی حقائق کا منت پذیر ہے۔ اس کا لطیف ترین احساس اور شعور سماجی زندگی کے مشاہدات اور ان کی ترتیب کا نتیجہ ہے۔ کبھی تو یہ صرف ترتیب شدہ مشاہدات اور تجربات کو ایک نئے تغیر کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ جو بالعموم سماجی اصلاحات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی یہ حقائق کے روابط بالکل ہی بدل دینا چاہتا ہے جو ایک انقلاب کی شکل میں رونما ہوتے ہیں۔ شعور کے اس انقلابی عمل سے جو تبدیلی پیدا ہوتی ہے وہ سماجی زندگی کے نئے روابط بھی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ ان نئے روابط سے ہمنوا ہونے کے لئے ایک نئی انسانی فطرت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی ضرورت کے ماتحت انسانی شعور ایک بار خود اپنی فطرت کے بدلنے پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ کلچر اسی تبدیلی کا نام ہے اور یہ تبدیلی صرف عقل کی تنظیم ہی سے ممکن ہے کیونکہ جذبات ایک زمانے تک مخصوص اداروں کے ساتھ وابستہ رہنے کے باعث ایک زبردست عصبیت اختیار کر لیتے ہیں جن کے ڈھالنے میں عقل اور علم سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اخلاقی قدروں کا وجود اسی تربیت فطرت میں مضمر ہے جب تک ایک نیا نظام اپنی ترقی پسند قدروں کی نگہبانی کرتا رہا ہے اور اپنی آزاد قوتوں پر نفس پرست بادشاہوں، امیروں اور جاگیرداروں کو قابض نہیں ہونے دیا ہے اس وقت تک کلچر کے محرکات انسانی فطرت کی تعمیر میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ لیکن جب کبھی زردار طبقوں کی رجعت پرست طاقت نے ان قوتوں کو اپنے ذاتی مفاد میں ڈھال لیا ہے تو کلچر نے بھی ہتھیار ڈال دیئے ہیں پھر ایک زوال پسند اور رجعت پرست نظام کے لئے ایک رجعت پرست فطرت کی بھی ضرورت پڑتی ہے یہی وہ سبب ہے کہ رجعت پرست طبقے علم و عقل کی مخالفت کرتے ہیں اور انسانی فطرت میں قدیم تعصبات کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فسطائیت سرمایہ داری کا ایک خارجی مظہر تھا لیکن فسطائیت کو یہ معلوم تھا کہ فسطائی نظام کے لئے فسطائی درندوں کی بھی ضرورت ہے چنانچہ اسی ضرورت کے ماتحت ہٹلر نے تعلیم اور انسانی ضمیر کی مخالفت کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ ”ضمیر انسان کا ایک وہم ہے۔ تعلیم اور ضمیر انسانوں کو فسوخ کر دیتے ہیں۔ مجھے یہ برتری حاصل ہے کہ میں اس قسم کے وہم سے بالکل آزاد ہوں“

یہ کچھ فاشزم ہی کے لئے صحیح نہیں ہے بلکہ تاریخ کے ہر رجعت پرست طبقے نے انسانی فطرت میں بہیمانہ جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر چند تاریخی ادوار کو لے لیجئے۔

عربوں کی تاریخ میں طلوعِ اسلام سے پہلے کا زمانہ ایام جاہلیت کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نام اس زمانے کو دراصل بعد میں دیا گیا کیونکہ اسلام نے سماجی اصلاحات سے جن نئی طاقتوں کو ابھارا تھا اس کا تقاضا قدیم جبلی عصبیتوں کو چھوڑ دینے کا تھا لیکن عرب کچھ اس طرح نسلی تعصبات اور قدیم مذہبی عصبیات میں گرفتار تھے کہ مسلمانوں کو خود اپنی فطرت کے خلاف صدیوں تک جنگ کرنی پڑی ہے اسلام کے تمدنی ارتقا کے ساتھ ساتھ اس داخلی جنگ میں بھی مختلف پیچ و خم آئے ہیں۔ بنوامیہ کے زمانے میں جب اسلام کی ترقی پسند قدروں پر رجعت پرست طبقے کا قبضہ ہوگیا تو خود مسلمانوں نے کلچر کا خون کیا ہے لیکن جب بنوعباسیہ کے دور میں اسلام نے از سرِ نو ترقی کی تو مسلمانوں کا کلچر بھی آگے بڑھا۔ دراصل یہ زمانہ ہارون رشید کا زمانہ تھا جبکہ ملوکیت کے ہوتے ہوئے ایک نیا تاجر طبقہ اسلام کی جمہوری روایات کو لے کر آگے بڑھا اور نوارسطو فلسفے کی تحریک میں اس نے اپنی عقل اور علم کو رہبر بنایا۔ حریت فکری کا ثبوت اس حد تک دیا گیا کہ مختلف ادیان کے حلقے بھی وجود میں آئے اور اس کے ساتھ کوئی تلخی نہیں کی گئی۔ لیکن اس تاجر طبقے کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے اور اسی کے ساتھ نشاۃ ثانیہ کی پوری تحریک نے خلافت کی اجارہ داری کو متزلزل کر دیا۔ مستعصم باللہ کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے یا تو وہ اپنی اجارہ داری سے دست بردار ہو کر حکمت اور سائنس کی ترقی میں مدد کرتا یا پھر اپنی اجارہ داری کو مضبوط کرنے کے لئے احیاءِ مذہب کے پردے میں تمام علوم و فنون کی ترقی کی مخالفت کرتا۔ مستعصم باللہ نے دوسرا راستہ اختیار کیا اس نے تمام بڑھتی ہوئی فکری تحریکوں کو سخت ضربیں پہونچائیں اور مذہبی جنون میں تمام رواداری اور اسلامی جمہوریت کو بالائے طاق رکھ دیا۔ بنوعباسیہ کا زوال اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے۔ یہ زوال نہ صرف ایک خاندان کا تھا بلکہ تمام اسلامی تمدن اور کلچر کا زوال تھا۔ ترکوں نے انھیں تاریک صدیوں میں جب بلغاریہ پر حملہ کیا تو اپنے مذہبی جنون میں وہاں کی فرسکو تصویروں پر تارکول لیپ دیا۔ اسلامی تاریخ میں اکثر و بیشتر ایسے مواقع آئے ہیں جبکہ ایک تیمور اور ایک غزنوی نے لوٹ اور غارتگری کا بازار گرم کیا ہے لیکن ایسی ہستیاں بھی گذری ہیں جنہوں نے کفر و اسلام کے تفرقات کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان کے کلچر کی تاریخ میں بھی ایسے ہی بہت سے تاریک اور روشن دور آئے ہیں۔

ابتدائی ویدک تہذیب میں خواہ مجرد فلسفے نے کتنی ہی ترقی کر لی ہو لیکن معاشی زندگی میں برہمنوں اور پروہتوں کے طبقے نے ایسی خرابیاں پیدا کر دی تھیں کہ بالآخر گوتم بدھ کو تمام مابعد الطبیعاتی مسائل سے منھ موڑ کر سماجی سدھار کا بیڑا اٹھانا ہی پڑا۔ اور اگر ماضی کے اس دھندلکے میں کوئی زرین دور نظر آتا ہے تو وہ صرف اشوک کا زمانہ ہے۔ میں اس زمانے کو کلچر کی ترقی کا بھی زمانہ سمجھتا ہوں کیونکہ بدھ دھرم کی تحریک نے ایک ایسے انسانی تصور کو جنم دیا جو ذات پات کی بندھنوں سے آزاد تھا۔ جس نے مابعد الطبیعاتی مسائل کے مقابلے میں معاشرتی مسائل کے حل کرنے میں زیادہ سرگرمی سے کام لیا جس نے روحانی اذیت کے ساتھ جسمانی اذیت کو بھی انسانیت کے منافی بتایا۔ پوری بدھ تحریک یا اشوک کا زمانہ اس لئے بھی زیادہ اہم ہے۔ بدھ مذہب کی زیادہ تر کتابیں عوام کی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ اور یہ تحریک اس قدر آگے بڑھی کہ بالآخر پالی زبان اشوک کے زمانے میں سرکاری زبان بن گئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ویدک سنسکرتی جس کا اظہار صرف سنسکرت زبان میں ہوتا تھا اور جو صرف پروہتوں کی زبان تھی اس نے اپنے کلچر کو ایک طبقے تک محدود کر رکھا ہے۔ اور جب تک کلچر کا دائرہ اتنا وسیع نہ ہو کہ اس کے گھیرے میں عوام بھی سمٹ آئیں اسے سنسکرتی کہنا تہذیب کی توہین ہے۔

لیکن اشوک کے زمانے کے بعد برہمنت نے اِس نئے کلچر پر بار بار حملے کئے۔ یہ حملے اندر اور باہر دونوں طرف سے کئے گئے۔

برہمنوں کا ایک بہت بڑا گروہ بدھ دھرم کے حلقے میں شامل ہوگیا تھا اُس نے مہایان یعنی اکثریت حاصل کر لی تھی۔ اسی برہمنوں کے گروہ نے بدھ دھرم میں مابعد الطبعیاتی مسائل کو جگہ دی اور اسے وید کے نظام فلسفہ سے مطابق کرنے کی کوشش کی۔ اس طبقے کی دوسری رجعت پرستانہ کوشش یہ تھی کہ اس نے بدھ دھرم کی تمام مذہبی کتابوں کو سنسکرت زبان میں منتقل کر کے سنسکرت کو مذہبی زبان ٹھہرا دیا۔ ظاہر ہے جب تعلیمات خواص کی زبان تک محدود کر دی جائیگی تو لامحالہ معاشرتی اصلاحات اور مساوات کا وہ جذبہ جو اس تعلیم کا محرک تھا سرد پڑ جائیگا۔ یہ تو برہمنوں کی اندرونی سازش تھی لیکن اس پر باہر سے بھی حملے کئے گئے۔ چونکہ اشوک کے زمانے کی فارغ البالی اور بدھ دھرم کی مساوات کی تعلیم عوام کی زندگی کا جزو بن چکی تھی اس لئے اس اثر کو ختم کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ویدک دھرم میں کچھ ایسی ترمیمیں کی جائیں جن سے عوام کو نزدیک کھینچا جا سکے۔ اس کوشش کی پہلی کڑی یہ تھی کہ برہمنوں نے سیو اور وشنو جو دراوڑوں کے دیوتا تھے انھیں اپنے نظام میں شامل کر کے ان کی پرستش شروع کر دی۔ چونکہ بدھ مذہب کا مہایان فرقہ گوتم بدھ کو اوتار بنا کر پہلے ہی سے پوجنے لگا تھا اس لئے یہ حربہ زیادہ کارگر ثابت ہوا۔

اس کی دوسری کڑی یہ تھی کہ گپت سلطنت نے پروہتوں کے اثرات کو اپنی حکومت سے ختم کر دیا۔ اس سے عوام کسی قدر مطمئن ہو گئے۔ چنانچہ اسی مصلحت بینی کے ماتحت منو نے ارتھ شاستر اور دھرم شاستر الگ الگ لکھیں اور اس میں اس بات کو واضح کیا کہ یوں تو قانون کو مذہب کے ماتحت بننا ہی چاہئے لیکن ایسے قانون بھی بنائے جا سکتے ہیں جن کا تعلق صرف عقل کے ساتھ ہے۔ اس ویدک دھرم اور برہمنیت کی تجدید نے ایک بار پھر ایسا سنبھالا لیا کہ سنسکرت زبان کو دوبارہ اس ملک میں فروغ ہوا۔ رزمیہ شاعری، ڈرامے، مصوری، بت تراشی سب وجود میں آئے اور وہ آج تک فنون عالیہ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن یہ احیاء تمدن ایک طرف تو وقتی تھا اور دوسری طرف ایک محدود حلقے میں گھر کر رہ گیا۔ دیسی زبانیں اب بھی بدستور جنگ کرتی رہیں اور ان میں بیشتر دکن کی زبانیں تھیں۔ گپت سلطنت کے زوال کے بعد سنسکرت زبان کا بول بالا بھی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی نئی زندگی بالکل عارضی تھی اور اب دکن میں شیو بھگتی اور وشنو بھگتی کی تحریکیں اٹھنے لگیں جن کے ماتحت دراوڑی زبانوں میں عقیدتمندانہ شاعری کا فروغ ہوتا ہے۔ ویدک تمدن کے وحدت کے خاتمے کے اسباب میں ہنوں کے حملوں کو بہت بڑی اہمیت دی جاتی ہے لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ویدک تمدن کی وحدت جھوٹی ہونے کے سبب عارضی تھی۔ ویدک تمدن میں ذات پات کی تفریق کے باعث ایک ایسا داخلی تضاد تھا کہ اس کا بکھرنا لازمی تھا۔ یہ ذاتوں کی تقسیم گپتوں کے زمانے میں اور بھی کڑی ہو چکی تھی پھر یہ کہ سنسکرت زبان نے عوامی رشتۂ وحدت کو منتشر کر دیا تھا۔ آٹھویں صدی میں شنکر آچاریہ نے ایک بار اس ویدک وحدت کا پھر سے راگ الاپنا چاہا اور اس میں شبہ نہیں کہ اس نے ویدک فلسفے کو بھی بہت سے مزخرفات سے پاک کر دیا لیکن اس نے مایا یعنی نفی حقیقت پر اتنا زور دیا کہ اسے ہندوستان کی جینے والی روح نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ زندگی کی لہر جو ویدک تعطل کے ردعمل میں بھگوت گیتا سے شروع ہوتی ہے اپنی آخری منزل رامانج کی تعلیم میں پالیتی ہے۔ دسویں صدی عیسوی میں رامانج نے وحدت الوجود اور محبت کے فلسفے کے زیر اثر جس بھگتی تحریک کی ابتدا کی وہ ہندوستان کے کونے کونے اور گوشے گوشے میں پھیل گئی۔ یہ ہندی روح جس کی ضمیر میں محبت، نرم روی بھائی چارگی کا جذبہ ہے وہ ایک بار اس نئی تعلیم سے جاگ اٹھتی ہے اس نے وحدت الوجود کی تعلیم میں ذات اور مذہب کی تفریقوں کو مسمار کر کے محبت کے آغوش کو کھول دیا۔ صدیوں کا دکھی انسان، پروہتوں کا ستایا ہوا انسان، راجپوتوں کا باجگذار انسان، بھوکا ننگا انسان، اپنے سائے سے لرزاں انسان بھگوان کے قدموں پر عقیدت کے آنسو رولنے لگا۔ یہ تحریک جب بارھویں اور تیرھویں صدی میں بہت آگے بڑھی تو مسلمان صوفیوں نے بھی اس کی آواز پر لبیک کہا۔ وحدت الوجود کا نسانی

اخوت اور مساوات دونوں تصوف کی تحریکوں کا بنیادی ایمان تھا۔ اس ہندی تصوف نے ایک ایسا روپ دھار لیا کہ بالآخر کفر و ایمان کے جھگڑے مٹنے لگے۔ قلندر نے جوگی کا بھیس بدلا۔ اور جوگی نے گیروا لباس زیب تن کیا۔ ہماری تہذیب کی یہی وہ مشترک اساس اور روایات رہی ہیں جہاں سے ہمارا ادب سیراب ہوتا رہا ہے۔ کبیر کی شاعری اسی تمدن کا نچوڑ ہے۔ امیر خسرو نے اسی کلچر کی تعلیمات کو پھیلانے کی کوشش کی ہے اور نانک نے اسی کلچرل وحدت کو اپنے گرنتھوں میں جگہ دی ہے۔

لیکن اس کلچر کی توسیع میں برہمنیت کے دعویدار، اور شریعت کے پیرے دار برابر رخنے ڈالتے رہے ہیں۔ مغلوں کے زمانے میں مسلمانوں کے درمیان دو فکری تحریکیں باہم دست و گریباں رہی ہیں۔ شریعت نے رجعت کا ساتھ دیا ہے اور طریقت کی تحریک ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں بہت ہی مددگار ثابت ہوئی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں فخر ہے کہ اردو کے تمام گرامی قدر شعراء نے طریقت کا ساتھ دیا ہے خواہ وہ صوفی ہوں یا رند۔ جب ہم میر کا یہ شعر پڑھتے ہیں ؎

میر کے دین و مذہب کو پوچھو کیا ہو اُن نے تو   قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

تو یہ صرف برائے شعر گفتن نہیں ہے بلکہ اس شعر میں میر کا وہ بنیادی عقیدۂ انسانیت جھلکتا ہے جس کو انھوں نے ایک دوسرے شعر میں پیش کیا ہے ؎

محبت نے کاڑھا ہے ظلمت سے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور!

چونکہ یہ شعر فلسفۂ تصوف کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے اور تصوف کی بہت سی قدریں ترقی کی قدروں کے منافی رہی ہیں اس لئے میں چند جملے تصوف کے صرف ایک پہلو کے بارے میں بھی کہنا چاہتا ہوں۔ میر کے شعر میں تصوف کے جس مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وجہ تخلیق کائنات محبت کا جذبہ ہے جو تمام مخلوق میں جاری و ساری ہے۔ یہ تفسیر تخلیق ایک غیر سائنسی نقطۂ نظر ضرور ہے لیکن یہ نظریہ مہلک حیات نہیں ہے۔ صرف ہمہ از اوست کا مسئلہ ایسا ہے جو بالعموم نفی حیات کی منزلوں کو جا ملتا ہے۔ لیکن یہ جذبہ اسی وقت زیادہ ملتا ہے جبکہ ایک زوال پسند نظام کی دشمنی نے خود اپنے ہی کو مٹا دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ غالب نے اس پورے نظریہ کو مع سماجی توجیہہ کے اپنے ایک شعر میں نظمبند کر دیا ہے ؎

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے   یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

تصوف کی بے خودی، اور ہمہ از اوست کی راہ فنا یقیناً ترقی اور زیست کی قدروں کے منافی ہے لیکن ہمہ اوست اور عشق کے نظریہ نے ایشائی ادب میں انسان دوستی کی روایات کی بنیادیں ڈالی ہیں۔ ہم آج ان ادبی روایات کو اپناتے ہیں کیونکہ انھیں قدروں سے اقلیم انسانیت کی سرحدیں وسیع ہوئی ہیں۔ یہ ادبی روایات نہ صرف ہندستانی ادب میں کارفرما رہی ہیں بلکہ ایرانی ادب کی بنیادیں ہیں۔ تمام ایرانی شعراء نے شریعت کو تنگ نظری اور رجعت کا نقاب سمجھ کر اس کی مخالفت کی ہے اور طریقت یعنی محبت کی قدروں کو آگے بڑھایا ہے۔ اور تمام مذہبی تعصبات سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا ہے۔ حافظ نے شریعت کے خلاف اتنی پھبتیاں کسیں کہ بالآخر مسلمانوں نے حافظ کے جنازے میں شرکت کرنے ہی سے انکار کر دیا یہ روایات ایرانی ادب میں اس قدر جڑ پکڑتی گئیں کہ بالآخر یہی شاعری کا فن قرار پایا۔ اسی روایت کے ماتحت عرفی نے کجکلاہوں کا مذاق اڑایا اور اپنے کو بند کفر و ایمان سے آزاد کر لیا ؎

من کجا کشمکش رد و قبولش زکجا۔   نیک رفتم کہ نہ کافر نہ مسلماں رفتم۔

ایران کی یہ حریت فکری فردوسی کے زمانے ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ جبکہ وہ اپنے ہم مذہب عربوں کے جارحانہ حملے کے خلاف اظہار نفرت کرتا ہے۔ اس باب میں فردوسی کے اشعار تو زبان زد ہیں لیکن میں ایک شعر خاقانی کا سنانا چاہتا ہوں جس کو اُس نے

طاق کسریٰ کی شکستہ حالت سے متاثر ہو کر لکھا تھا ؎

ما بارگہ دادیم ایں وقت ستم برما | بر قصر ستمگاراں آیا چہ رود خذلاں

خاقانی مذہبی آدمی تھا اور یہ شعر اس نے اس وقت لکھا تھا جبکہ وہ مدینہ حج کے لئے جا رہا تھا۔ وہ قطعی اس امر سے متاثر نہیں ہے کہ اگر عربوں نے ایران پر حملہ نہ کیا ہوتا تو وہ مسلمان کیونکر بنتا۔ وہ طاق کسریٰ کی بربادی کو صرف ظلم کی علامت سمجھتا ہے اُردو شعرا فارسی ادب کی انھیں روایات سے ہمیشہ متاثر رہے ہیں۔ انسان دوستی ان کا مسلک رہا ہے، اور شریعت کی تنگ نظری کے خلاف جہاد کرنا اس کا شیوہ رہا ہے۔

غالب کی شاعری میں اس قسم کے بیسیوں شعر موجود ہیں جس میں انھوں نے مذہب کی تنگ نظری کی مخالفت کی اور خود اپنے کو ایمان کی بندشوں سے آزاد کر لیا ہے ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم | ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں
دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا۔ | واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں۔
خوش بود فارغ ز بندِ کفر و ایماں زیستن | حیف کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن

جس طرح یہ جنگ مسلمانوں کے درمیان چلتی رہی اور جس کا عکس اُردو شاعری پر پڑتا رہا ہندوؤں کے درمیان بھی تجدیدیت اور کٹر پن کے خلاف ہندو شعراء جنگ کرتے رہے۔ کبیر، سورداس، بہاری۔ چندی داس، اور گرونانک اسی کلچر کے رہنما تھے، اور جس طرح مسلمان صوفیوں نے عوام سے قریب تر ہونے کے لئے فارسی زبان چھوڑ کر ملکی زبان میں شاعری کی ہے اسی طرح ہندو صوفیوں نے بھی سنسکرت زبان کو ترک کر کے عوام کی زبانوں کو اپنایا ہے ہندو اور مسلمان کی یہ ملی جلی روایات نئے انسان کی تعمیر میں ... تک کام کرتی رہیں جبتک کہ مغلوں کے سینے صاف تھے اور ہندوستان نے خانہ جنگی کی وبا میں گرفتار ہو کر اس کا موقع نہیں دیا کہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں اپنے اثر اور اقتدار کو بڑھانے کے لئے مذہب کا نعرہ استعمال کریں لیکن یہ خلیج اس وقت بھی اتنی وسیع نہ ہوئی جتنی کہ برطانیہ کے زیر اثر ہوئی ہے اس کے کیا اسباب تھے۔

ہندو اور مسلمان دونوں ہی غلام ہو جانے کے باعث اپنی باہم ذمہ داریوں کو فراموش کر گئے۔ اور جب انھیں ایک مرتبہ ... تو اس کی فکر بھی باقی نہ رہی کہ تمدن اور کلچر کے جمہوری اساس کیا ہیں۔ یہ جاگیردار طبقہ جو ابتک اس کلچر کا رہنما تھا اس نے سیاست ... ہار مان کر کلچر سے بھی دست برداری اختیار کر لی۔ مشاعروں کی شمعیں بجھنے لگیں اور تصوف کی آوازیں دھیمی پڑنے لگیں ... انگریزی ... نظام اور تعلیم کا پہلا اثر یہاں کے متوسط طبقے پر پڑا جو دراصل اسی نظام کا پروردہ تھا اور جو مغرب کی ذہنی ... اُٹھا چکا تھا۔ نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع شروع میں اسی طبقے میں اٹھی اور بہت دنوں تک اسی طبقے میں محدود رہی ... محرک ہندو اور مسلمان دونوں کا احساس کمتری تھا۔ اس لئے سب سے پہلے انھوں نے مذہبی اصلاحات کا بیڑہ اٹھایا اور اپنے اپنے مذہب کو سائنس سے قریب تر لانے کے لئے نئی توجیہات سے کام لینا شروع کیا۔ اسی سلسلے میں انھیں اپنے ماضی کے صفحات اُلٹنے پڑے اور جہاں کہیں انھیں ذرا سی روشنی نظر آئی، سے مغرب کو دکھانے کی کوشش کی کہ دیکھو ہمارے مذہب میں یہ بات پہلے سے تھی۔ اوّل تو یہ کہ نشاۃ ثانیہ کی تحریک نظری فکری تھی جس کا تعلق عوام کی زندگی سے نہ تھا۔ اور اگر اس کا تعلق ملک کی سیاست سے تھا تو وہ اسی قدر تھا کہ انگریز دشمنی چھوڑ کر وفاداری کا پیمان کیا جائے۔ ایک صحت مند نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے تو یہ معنی تھے کہ جاگیردارانہ نظام کے ذہنی کالبد کو اتار پھینکا جائے۔ کیونکہ اگر جاگیردارانہ نظام سیاسی نہج سے دم توڑ چکا تھا اور وہ سامراجیت سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا تو اس کا نظام فکر بھی مُردہ تھا۔ اس نظام فکر میں مذہب کی ایک بہت بڑی اہمیت تھی جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اصلاحیں ناکافی تھیں تاوقتیکہ اسکی بنیادوں پر حملہ نہ کیا جاتا اور سائنس کے اصولوں کو سامنے رکھ کر عقل کی رہبر

میں تنظیم حیات نہ کی جاتی۔ نشاۃ ثانیہ کا یہ تاریخی کام جو یورپ میں اٹھارویں صدی میں کارفرما تھا اور جس کی رہبری خود تاجر طبقے نے کی تھی فرانسیسی انقلاب کے بعد بالکل رک گیا تھا۔ کیونکہ جب تک تاجر طبقوں کو جاگیردارانہ نظام کے خلاف عوام کی قوت درکار تھی انھوں نے اس حربے کو بخوبی استعمال کیا۔ مذہب کیونکہ کسی سیاسی نظام کا پاسبان بن جاتا ہے اس کی بہترین مثال کلیسا کے اداروں میں ملتی ہے۔ یورپ میں جاگیردارانہ نظام کو ڈھانے کے لئے یہ یک وقت کلیسائی اداروں پر بھی حملہ کرنا پڑا تھا لیکن جب تاجر طبقہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکا تو اس نے اپنے اس تاریخی کام سے بھی ہاتھ اٹھا لیا اور عوام کو کلچر سلانے کی خاطر اس نے مذہب کی ازسرنو توجیہہ کرکے اسے عقل سے مجلا کرنے کی کوشش کی لیکن سائنس کی بڑھتی ہوئی طاقتوں نے جب عقلی توجیہات کے مصنوعی معیاروں کو بھی ڈھانا شروع کیا تو انھوں نے مذہب پر سے عقل کا چھاپ بھی اٹھا لیا اور اسے خالص جذباتی اور صوفیانہ بنا دیا۔ ہندستان میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک یورپ کے مقابلے میں چار سو سال بعد میں اٹھتی ہے۔ یہ اس وقت وجود میں آتی ہے جبکہ یورپ میں مذہب کو عقل کے سانچے میں ڈھال کر ایک لبرل قسم کا فلسفہ وجود میں آ رہا تھا۔ ہمارے ملکی مصلحین نے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اسی قسم کے مذہب کی تلقین کی۔ یہ سامنتی نظام فکر سے ایک قسم کا سمجھوتہ تھا۔ کیونکہ متوسط طبقے کا گہرا تعلق زمیندار طبقے سے تھا جو سامراجیوں کا نمائندہ بن کر کسانوں کی لوٹ کھسوٹ میں مبتلا تھا۔ یہ طبقہ جس کے وجود کا ضامن انگریزی راج ہے جاگیردارانہ اسلوب سے اپنے باج گزاروں کو لوٹنا چاہتا تھا۔ ادھر متوسط طبقہ میں جو چھوٹا سا تاجر طبقہ ابھر رہا تھا اس کی تجارت کا دارومدار بھی انگریزی تاجروں کی معاونت ہی میں مضمر تھا۔ یہی وہ اسباب تھے کہ ہندستان میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک صرف ایک ہلکی سی فکری تحریک بن کر رہ گئی جس کا دائرہ اوپری اور متوسط طبقے تک ہی محدود رہا۔ اس تحریک کا تعلق عوام کی زندگی سے نہ تھا اور نہ اس نے ہندستانی تہذیب اور عوامی کلچر کی طرف توجہ کی۔

جب کانگریس کی تحریک اوپری حلقے سے کھسکتی ہوئی عوام تک پہونچی تو اس دوری کا شدید احساس پیدا ہونے لگا۔ لیکن چونکہ رہنماؤں کی تربیت انگریزی لبرل فلسفہ اور رام موہن رائے کی اصلاحی تحریک میں ہوئی تھی اس لئے وہ سماجی انقلاب اور عوامی کلچر کے تعلقات پر سوچنے سے بالکل قاصر رہے۔ وہ اگر سیاست میں انگریزی پارلیمنٹری راج کے قائل تھے تو کلچر اور تہذیب کے بارے میں ان کا ظاہری تعلق قدرے بورژوا قدروں کا تھا، اور قدرے ویدک تہذیب کی تجدیدیت پر ایمان رکھتے تھے۔ کانگریس تحریک اچھوتوں اور مسلمانوں کے مسئلوں کے حل کرنے میں اسی لئے ناکام رہی کہ اس نے ہندستانی کلچر کی بنیادوں کا پتہ نہیں چلایا، اس نے اس مشترکہ کوششوں کو نہیں ابھارا جو چھ سو سال سے اس کی تعمیر کر رہی تھیں۔ اس کے رہنماؤں نے اپنی آستینوں سے بت نہیں جھاڑے اور نہ اپنی بھرپور آغوش اچھوتوں کیلئے کھولی۔

کانگریس کی تحریک میں جب ایک بار ایسا موقع آیا کہ اچھوت برہمنیت کے خلاف انقلاب پر آمادہ ہوگئے، تو اچھوتوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ہندو مذہب کی ازسرنو تعریف کی گئی۔ اسے ویدوں کے فلسفے سے بھی الگ کرکے صرف ایک مخصوص طرز معاشرت بتایا گیا۔ لیکن یہ حربہ موجودہ ہندوستان کی سیاست میں کارگر نہ ہوسکا کیونکہ ہندوستانی کلچر اگر ایسے کسی ایک نام سے یاد کیا جاسکتا ہے تو ایک مشترکہ کلچر ہے جس نے بے شمار قوموں اور گروہوں کے اثرات کو قبول کرکے مشترک قدروں پر بڑھنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان مشترک قدروں کی آمیزش ہمیشہ عوامی تحریک اور عوامی کلچر کی کوششوں سے ہوئی۔ اکثر یہ کام بادشاہوں کی سرپرستی میں بھی انجام پایا ہے لیکن بالعموم یہ موقع ہمیشہ ایک ایسے ہی وقت پر ان بادشاہوں کے ہاتھ آیا ہے جبکہ امتزاجی عمل اپنے ایک نقطۂ وحدت کو پہونچ رہا تھا۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے ہی ہندوستان کی زندگی میں جو سیاسی انتشار پھیل چکا تھا

اس نے کلچر کی وحدت اور مشترک قدروں کو بھی صدمہ پہونچایا۔ انگریزوں کے لئے ہمارے تمدنی وحدت کا انقطاع ہماری سیاسی موت سے زیادہ اہم تھا کیونکہ قوموں کی زندگی میں مضبوطی اور استواری کلچر ہی کی طاقت سے پیدا ہوتی ہے۔ سیاسی اعتبار سے تو ہندوستان برطانوی راج میں ایک سلک میں منسلک کر دیا گیا لیکن انگریزوں کے زمانے میں کوئی ایسی تحریک نہ اُٹھنے پائی جو ہندوستانی کلچر کی مشترک قدروں کو استوار کر سکتی بلکہ ایسی طاقتوں کو قوت پہونچائی گئی جن میں دوری اور اختلافات کی راہیں زیادہ روشن تھیں۔ ہندوستان کے نشاۃ ثانیہ کی بنیاد ہی ٹیڑھی پڑی اور اس بنیاد میں انگریزوں کا بھی ہاتھ تھا۔ ہندوؤں نے آریائی طہارت اور اپنشدوں کے روحانی فلسفہ کو اُجاگر کرنا چاہا تو مسلمانوں نے ہسپانیہ اور بلقان کی فتوحات پر غور کرنا شروع کیا۔ چونکہ متوسط طبقہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے قومی زندگی کا رہنما بن چکا تھا اس لئے یہ اثرات عوام کے ذہن و دماغ پر بھی اثر کرتے رہے۔

لیکن ہندوستان کی موجودہ ذہنی پستی اور سیاسی خلفشار میں مذہبی ایک سبب کارفرما نہیں ہے۔ اس سے زیادہ اہم یہاں کے مختلف طبقات کی اقتصادی جنگ ہے جو سیاست اور تمدن دونوں ہی پر اثر انداز ہوئی ہے۔ سیاسی اور اقتصادی تجزیہ کی تفصیل میں میں جانا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ امر واضح ہے کہ جاگیردارانہ نظام کے بچے کھچے عناصر کو قائم رکھنے میں ہندو رجواڑوں اور مسلمان نوابوں دونوں ہی کے مفاد پلٹے جاتے ہیں۔ اسی طرح ملکی سرمایہ داروں کی جدوجہد میں چونکہ مسلمان ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے تھے اور ان کے بڑھنے کے امکانات اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ وہ کسی ایک خاص حصے میں ہندو سرمایہ داروں سے آزاد ہو کر اپنی حکومت نہ قائم کر لیں۔ انگریزوں کے سامنے ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کے یہ متضاد عناصر پیش نظر تھے انھوں نے اس سے بھرپور فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن کانگریس اور لیگ کی تحریک میں قدرے اختلاف بھی ہے کانگریس نے عوامی تحریک کو برطانوی سامراج کے خلاف بڑھایا کیونکہ ملکی سرمایہ دار عوام کی معاونت ہی سے اپنی قومی جنگ لڑ سکتے تھے۔ جب تک یہ جنگ مہم آزادی کے تصورات پر چلتی رہی اور صرف انگریز دشمنی کے جذبے کو اُبھارا گیا ہندو اور مسلمان عوام نے برابر ساتھ دیا لیکن جب بھی ایسی شکل نظر آئی کہ برطانوی سامراج سے معاہدہ یا مراعات کی بات چیت ہونے لگی تو مسلم لیگ کے رہنماؤں نے ہمیشہ حصے بخرے کا سوال اُٹھایا ہے۔

چونکہ کانگریس کے اندرونی تضاد سے لیگ واقف ہو چکی تھی اور اسے موقع بہ موقع برطانوی شہ بھی ملتی رہی اس لئے وہ اپنے مطالبات پر اٹل ہوتی گئی۔ اس رکاوٹ کے توڑنے کا ایک ہی واحد ذریعہ تھا کہ کانگریس تمام سمجھوتے اور مراعات کے خیال کو ترک کر کے مکمل آزادی کی جنگ لڑتی، لیکن اس عرصے میں مختلف مورچوں پر رجعت پرست اداروں کے خلاف عوام نے اتنے بہت سے حملے کئے تھے اور ان کی طاقت اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ اب اس کو آگے بڑھانے کے یہ معنی تھے کہ تمام رجواڑے زمیندار اور ملکی سرمایہ دار اپنے پروانۂ موت پر خود دستخط کر دیں۔ یہی وہ خوف تھا جس کے سبب سے کانگریس تقسیم ہندوستان پر راضی ہو گئی۔

دراصل ماؤنٹ بیٹن کا تحفہ ایک باہمی مفاہمت ہے جسے تینوں جماعتوں نے اپنے مفاد کو سامنے رکھ کر قبول کر لیا ہے برطانوی سامراج نے ملک گیری اور سیاسی اقتدار سے ہاتھ اٹھا کر صرف اقتصادی لوٹ پر اکتفا کیا اور اس لوٹ میں ہندوستان کے سرمایہ دار اور رجواڑوں کو بھی شعوری طور پر ساتھ لے لیا ہے۔ ملکی سرمایہ دار بین الاقوامی سیاست کے پس منظر میں اسی پر اکتفا کرنا چاہتا ہے کہ جو کچھ جنگ کے زمانے سے اب تک اس نے تجارت پر غلبہ پایا ہے اسکو قائم رکھے اور برطانوی امداد سے بحیثیت شریک کار کے ملک کی صنعتی زندگی میں حصہ لے اور جس طرح بھی ممکن ہو سکے انگریز دشمنی کا جذبہ ختم کیا جائے اور مزدوروں کی بڑھتی ہوئی

طاقت کو روکا جائے۔ لیکن اس طاقت کے روکنے میں بھی اسے معاون اور مددگار کی ضرورت ہے۔ کیونکہ مزدوروں اور کسانوں کا اتحاد سامراج دشمن جنگ میں اتنا بڑھ چکا ہے کہ اس کا توڑنا آسان نہیں ہے۔ پھر یہ کہ قدیم ہندوستان کے کلچر کی جڑیں یہاں کے دیہاتوں ہی میں پھیلی ہوئی ہیں، جہاں شہری فرقہ وارانہ نشاۃ ثانیہ نے اتنا زہر نہیں بویا ہے جتنا کہ شہروں میں۔ تاہم رسل و رسائل کے ذرائع بڑھنے اور کسانوں کے مزدور بننے کے سلسلے میں وہ پرانی قلعے بھی اس سے مضبوط نہیں رہ سکتے ہیں۔ یہ وہ اسباب تھے جن کی مدد سے انگریزی سامراج اور ملکی سرمایہ داروں نے رجواڑوں کو اپنے ساتھ لیکر سیاسی اور اقتصادی جنگ کو فرقہ وارانہ جنگ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اس جنگ کے تین پہلو ہیں جسے نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔

(۱) فرقہ وارانہ جنگ سے انگریز دشمنی کا جذبہ ختم ہوگا۔

(۲) فرقہ وارانہ جنگ میں ہندو اور مسلم مزدور اور کسانوں کا اتحاد ختم ہوگا۔

(۳) فرقہ وارانہ جنگ نقض امن کا شاخسانہ بنے گا جس سے شہری آزادی سلب کی جا سکتی ہے۔

(۴) فرقہ وارانہ جنگ کو بڑے پیمانہ پر بڑھا کر پاکستان اور ہندوستان کی جنگ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ خواہ عمل میں نہ آسکے لیکن اسے ایک ایسے خطرے کی طرح پیش کیا جا سکتا ہے جس سے ملک کی تمام سیاسی جدوجہد کو فرقہ وارانہ طرز فکر پر ڈھالا جا سکتا ہے یہ تو فرقہ وارانہ جنگ کے سیاسی پہلو ہیں لیکن عوام کے ——— کلچر کو ختم کرنے کے لئے کچھ اور بھی تدبیریں سوچی گئی تھیں جن کا تجزیہ اس طرح ہو سکتا ہے۔

(۱) ملکی زبان کا ادبی سرمایہ غارتگروں اور ظالموں کے خلاف ہے۔

(۲) دیہات کا کلچر ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد ہے۔

(۳) سائنس، علم، کتب خانے، انسانیت کا پرچار کرنے والے ادارے۔ یہ سب چیزیں عوام کو متحدہ طور پر ظالمانہ اور طبقاتی نظام حکومت ختم کرنے پر اکسا رہے ہیں۔

(۴) مسلمانوں کی اقلیت ہمیشہ ایک مشترکہ کلچر کو تصور میں سوچتی آئی ہے۔ ان کی تحریک سے برہمنیت کو سخت چوٹ پہنچی ہے ذات پات کی دیواریں متزلزل ہوئی ہیں۔ اس مخلوطی کلچر کو اسلامی کلچر کہہ کر ان کو روحانی طور پر گھائل کیا جائے تاکہ ہندو عوام سے مشترکہ کا رشتہ قائم نہ ہو سکے۔

(۱) کی رو سے سنسکرت زبان کا نعرہ بلند کیا گیا۔

(۲) کی رو سے دیہاتوں میں ہتھیار تقسیم کئے گئے اور انھیں خون ریزی میں مبتلا کر کے کسانوں کو زمینوں سے بے دخل کیا گیا۔

(۳) کی رو سے ڈاکٹر، پروفیسر قتل کئے گئے۔ بہت سے سائنس کے تجربہ خانے اور کتب خانے جلائے گئے۔

(۴) کی رو سے اردو زبان پر حملہ کیا گیا، اردو زبان کو غیر ملکی اور مسلمانوں کی طرز معاشرت کو غیر ملکی بتایا گیا۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ ان میں سے کیا کیا چیزیں پہلے پاکستان میں ہوئیں اور پھر ہندوستان میں۔ کیونکہ برطانوی معاہدے کی رو سے دونوں ملکوں میں ان چیزوں کا ہونا ضروری تھا۔

دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کسی ملک کو سیاسی آزادی ملی ہے تو اس ملک کی اقتصادی حالت بھی بہتر ہوئی ہے اور کلچر کو بھی فروغ ہوا ہے۔ اب آپ خود سوچئے ۱۵ راگست کے بعد کیا آپ کا کلچر اور آپ کا تمدن آگے بڑھا؟ کیا آپ کی اقتصادی حالت بہتر ہوئی ہے یا اس کے بہتر ہونے کے فوری امکانات نظر آ رہے ہیں۔ کیا اس زمانے میں آپکی شہری آزادی سلب نہیں کی گئی ہے۔ کیا آپ سے یہ نہیں کہا گیا ہے کہ آج صرف ہندو اور مسلمان کے تصورات میں سوچنا ہے کیا مزدوروں سے یہ نہیں کہا گیا ہے کہ انھیں اپنی سیاسی جدوجہد ختم کر کے ملکی سرمایہ داروں سے صلحنامہ کرنا چاہئے۔ کیا بہاول پور اور مالیر کے راجگان ہیرو بن کر منصۂ شہود پر

نہیں آئے ہیں۔ کیا زمینداری کو رعیت واری میں بدل کر کسانوں کو لوٹنے کی تدبیریں نہیں کی جا رہی ہیں؟۔

اگر یہ حقیقتیں ہیں تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہندوستان کو شمہ برابر بھی آزادی ملی ہے۔ ہاں آزادی اس طبقے کو ضرور ملی ہے جو اپنی ریاستوں کو از سر نو آراستہ کر رہے ہیں، ان ملکی سرمایہ داروں کو ملی ہے جو انگریز پارٹنروں کے ساتھ عوام کی طاقت کے کچلنے میں از سر نو منہمک ہیں۔ اور اس کوشش میں اس حد تک آگے جا چکے ہیں کہ لکھو کھا ان کے ان تاریک غاروں کو کھود رہے ہیں جہاں بھیڑیوں نے اپنا مسکن بنایا تھا۔ ہندو مہا سبھا کی سرپرستی نہ صرف زمیندار اور رجواڑے کر رہے ہیں بلکہ سرمایہ داروں کا ہاتھ بھی ان کی پیٹھ پر ہے۔ آج دنیا کی سرزمین پر سرمایہ داری کا بقا صرف ایک ہی صورت سے نظر آرہا ہے کہ وہ خود اپنی ترقی پسند قدروں کو ختم کر دے۔ ان قدروں میں وسیع جمہوریت کے تصورات اور انسان دوستی کی تحریک کو بہت بڑا دخل رہا ہے۔ چونکہ ہندوستانی سرمایہ دار بین الاقوامی سیاست کے پس منظر میں اپنی آزادی قائم نہیں رکھ سکتا ہے اس لئے وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے بھی جنگ نہیں کر سکتا ہے۔ اور نہ عوامی طاقت کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں اس سے یہ ہی ممکن ہے کہ وہ انیسویں صدی کی لبرل جمہوریت کو قائم کر سکے۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر ہندوستان کو نہ صرف انقلاب شکن تحریک سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے بلکہ کلچر شکن تحریکوں سے بھی مقابلہ درپیش ہے۔ اور اس رجعت پرست تحریک میں نہ صرف برطانوی سامراج بلکہ دیسی سرمایہ دار، ان کی اسٹیٹ مشینری، رجواڑے، زمیندار، نواب اور جاگیردار سب ایک ساتھ مل کر حملہ کر رہے ہیں۔ جب تک ہندوستان میں سرمایہ داروں کی نمائندہ حکومت موجود ہے نہ تو فرقہ وارانہ زہر ختم ہو سکتا ہے اور نہ مخلوطی کلچر اور جمہوریت کے تصورات ہی کو فروغ ہو سکتا ہے۔ آج سرمایہ دارانہ اور بچے کچے جاگیردارانہ نظام کے عناصر کی سیاسی پالیسی کا جو تعلق کلچر شکن قوتوں کے ساتھ ہے وہ اس حد تک بے نقاب ہو چکا ہے کہ ہم کو ماضی کے اوراق الٹنے کی بھی ضرورت نہیں —— آج یہ سوال نہ تو ذہنیتوں کا ہے اور نہ فکری رجحانات کا۔ ان رجعت پرست پالیسیوں کا تعلق سیدھے سیدھے وراثتی میراث اور طبقاتی مفاد پسندی سے ہے۔

اسی لئے آج ہماری جنگ کا عنوان بھی بدل چکا ہے۔ یہ جنگ نہ تو اب شریعت اور طریقت کی رہ گئی ہے اور نہ یہ جنگ صرف برہمنت کے خلاف مورچہ ہے گو کہ ماضی کی تمام بچی کچی ہوئی داستانوں کا حساب بھی اس جنگ میں چکایا جا رہا ہے۔ لیکن یہ جنگ صرف فکری رجحانات سے بہت آگے نکل چکی ہے۔

آج سیدھے سیدھے وہ سیاسی پالیسی اور دو کلچر کی جنگ ہے۔ چونکہ رجعت پرست حلقے کے سامنے کسی نئے انسان کا تصور نہیں ہے اس لئے وہ ماضی کی ہولناک اور خونخوار تصویروں کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ عوامی کلچر کی تحریک نے نئی سیاسی شعور کی روشنی میں ایک نئے آدم کے تصور کو جنم دیا ہے۔ اس کا ماضی ان تمام ہلکی ہلکی لہروں کا مجموعہ ہے جنہوں نے اپنے وقت کے زنجیر و سلاسل کے خلاف سر ٹکرایا ہے، اس کا ماضی وہ رشتۂ شوق جنوں ہے جس نے بارہا کاہنوں کے آتشکدے بجھائے ہیں اور پروہتوں کو جسم کر زنار اتاری ہے، اس کا ماضی ان گمنام بغاوتوں کے جزیروں میں دفن ہے جو سطح پر آنے سے پہلے ہی زمیں دوز ہو گئے ہیں۔ اس کے ماضی کے بنانے والے وہ تمام اکابر و اسلاف ہیں جنہوں نے اپنے صحیفوں کو پیشروؤں کے صحیفوں پر ترجیح دی اور جنہوں نے علم و عقل کی روشنی میں الہامی صحیفوں کی قندیل گل کر دی ہے، اس کے ماضی میں کلیسائی غارتگری، بخارا کے ملاؤں کا ظلم اور پروہتوں کی خون آشام داستانیں دفن ہیں۔ یہ انسان نہ تو دراوڑی ہے نہ آریائی اور نہ سامی، یہ ہر نسل کو توڑتا ہوا، اعتقادات اور تعصبات کی بنیاد ڈھاتا ہوا صرف عقل کی روشنی میں بڑھتا رہا ہے۔ اس نے شریعت کو بھلا کر انسانی شریعت کا سراغ لگایا ہے۔ یہ انسان ہمارے آپ کے لئے نیا نہیں ہے یہ ہمارے ادب میں برسوں سے پروان چڑھتا رہا ہے اور ہمارے ادیب اسی انسانی شریعت کی روشنی میں ڈھلنے کی کوشش کرتے رہے ہیں آج کیوں ہماری روح کا تعمیری حربہ

کندہ پڑ گیا ہے اور ہم سرمایہ داروں کے جارحانہ حملے سے گمراہ ہو کر یہ سوچنے لگے کہ کہیں ہمارا خواب بے معنی تو نہیں ہے؟ لیکن ہم ایک ذہنی بت تو نہیں بنا رہے ہیں۔ لیکن ایسا تو نہیں ہے کہ پوری انسانیت میں بہیمانہ جذبات ازلی اور ابدی ہیں۔ ہمارے فنکاروں کا یہ شک کبھی کبھی کلبیت کی حد تک بڑھ کر عوام دشمنی کی سرحد سے جا ملا ہے۔ یہ ان کے صداقت احساس کی ایک تلخی ہے جو شاید اُمید فزا سے زیادہ پُر حقیقت ہے لیکن یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہمارا دشمن فنکار نہیں ہے۔ وہ ہماری تلخیٔ حیات کو نراشیت میں بدل دینے کے لئے تیار ہے۔ وہ تو اس کا بھی موقع دیتا ہے کہ ہم نراجی ہو جائیں۔ اپنی قوتیں منتشر کر دیں، اپنے خواب کو دُھندلا دیں اور اپنے حوصلوں کو پست کر دیں۔ اگر آپ ہندوستان کی تمام ملکی زبانوں میں ایک نئے انسان کی فطرت کی تعمیر میں حصہ لے رہے تھے جس کا مستقبل زیادہ روشن ہے اور ماضی تاریک رہا ہے تو یہ نہ بھول جائے کہ وہ انسان آج بھی زندہ ہے مرا نہیں ہے۔ وہ انسان نہ تو پنجاب میں مرا ہے اور نہ بنگال میں۔ وہ اس تاریک فضا میں بھی لڑ رہا ہے اور لڑتا رہیگا۔ یہ وہی انسان ہے جس نے مہاتما کے خون کا بدلہ لیا ہے، وہ جس نے ایکبار بڑھ کر اپنے گھناؤنے ماضی پر بھی حملہ کیا ہے، اس نے برہمنوں کی گردن پھر مروڑی ہے۔ اور نشاۂ ثانیہ کے ہہلک اثرات پر نکتہ چیں ہے۔ وہ آپ سے اپنا ماضی اپنا حال اور اپنا مستقبل چاہتا ہے اسے ظالموں کے ماضی سے رہا کیجئے۔ ان کے حال سے متنبہ کیجئے۔ اور اسے اپنا مستقبل بتایئے۔ ہم اپنے کلچر کو اور انسانیت کے کلچر کو یوں ہی بچا سکتے ہیں اور ایک نئے کلچر کی ترویج میں حصہ لے سکتے ہیں۔ اس کلچر کی جانبداری میں ہم جھجکنا اور شرمانا بھی نہیں ہے کیونکہ دشمن بڑی بے شرمی سے کلچر شکن طاقتوں کا ساتھ دے رہا ہے۔

وہ ہر ایک عوامی کوشش کو ان کے ہر ایک بڑھتے ہوئے حملے کو اپنی نئی چالوں سے نفی کرنا چاہتا ہے۔ اگر عوام نے R.S.S اور مہاسبھا کی جماعتوں پر حملہ کیا تو سرمایہ داروں نے پلٹ کر عوامی تنظیم پر حملہ کیا، شانتی سنیا اور لال فوج پر پابندیاں عاید کر دیں عوامی تھیٹر کے سب ناٹکوں گانوں اور بہت سے ادبی رسالوں کو ممنوع قرار دیدیا۔ یہی وہ حقیقتیں ہیں جو آج ہمیں طبقاتی جنگ کے لئے مجبور کر رہی ہیں۔ اس جنگ میں اگر ادیبوں نے سیاسی اور عملی طور سے ساتھ نہ دیا اور صرف اُبہام کلبیت اور نراشیت میں مبتلا رہے تو عوام بھی ان پر شک و شبہ کی نظر ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

شعر را مقصود گر آدم گری است
شاعری ہم وارث پیغمبری است

(اُردو کانفرنس لکھنؤ)

اختر انصاری

غزل کا ماضی، حال اور مستقبل

غزل کئی سو سال سے ہماری شاعری کی روحِ رواں بنی ہوئی ہے۔ عشقیہ شاعری کی یہ صنف ہمیں ایرانی شاعری سے ورثے میں ملی۔ ہم نے نہ صرف غزل کی ساخت، ہیئت اور خارجی اسلوب ورثے میں پایا، بلکہ مضامین، موضوعات، تخیلات، مفروضات، تصوّرات اور علائم کی ایک بنی سجائی اور وسیع وبے کراں دنیا بھی ترکے میں حاصل کی۔ گویا شعر وسخن کی وہ صنف جو ایران سے ہم تک پہنچی، ظاہری ومعنوی دونوں حیثیتوں سے مکمل تھی اور اس کی یہ دونوں حیثیتیں ہمارے تصرف میں آئیں۔

ایک طرف غزل کی ظاہری ہیئت اور اس کے ساتھ اوزان و بحور کا ایک طویل اور جامع نظام، اور دوسری طرف خیالات ومضامین، تشبیہات واستعارات، تلمیحات وکنایات اور اسالیب وعلائم کا ایک شاندار ذخیرہ، یہ دونوں چیزیں ہماری ابتدائی بلکہ اوّلین شاعری کے اکتسابات میں قدرتی طور پر داخل ہوگئیں۔ یہ سرمایہ کوئی معمولی سرمایہ نہ تھا جس وقت یہ فارسی شاعری سے ہماری شاعری میں منتقل ہوا ہے اس وقت نشو ونما، تنقیح وتہذیب اور پختگی وبالیدگی کی کئی صدیاں اس پر سے گزر چکی تھیں۔ اس عظیم الشان فنی سرمائے اور شعری ذخیرے کی ابتدا عربی زبان کے اس قصیدے سے ہوتی ہے جس میں توانائی تھی، جوش تھا، مضامین وموضوعات کا تنوع تھا، تجربات وخیالات کی اصلیت وواقعیت تھی، سادگی تھی، فطریت تھی، مگر شاید وہ تراش خراش، وہ بداعتِ اسلوب، وہ نزاکتِ خیال اور افکار وتخیلات کی وہ رنگارنگی نہ تھی جو آگے چل کر فارسی شاعری کا نمایاں وصف قرار پائی۔ عربی قصیدے نے زمانہ جاہلیت میں عروج وارتقا کی منزلیں طے کی تھیں۔ اسی ایک صنفِ سخن پر ساری عربی شاعری مشتمل ومنحصر تھی۔ پھر اسلام کی ابتدا ہوئی، اور اسلامی اقدارِ حیات کی اشاعت ومقبولیت نے اُس قبائلی عصبیت کو محو کر دیا جو جاہلیت کی شاعری کے محرکات میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ غالباً اسی باعث خلافتِ راشدہ کے دور میں عربی شاعری اس جوش وخروش اور طمطراق سے محروم رہی جو زمانۂ قبلِ اسلام میں اُس کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔

بنی اُمیّہ کے عہد میں بدویانہ زندگی کی قدروں نے شاید ایک دفعہ پھر اپنا رنگ جمایا اور عربی قصیدے میں دوبارہ وہی پرانی آن بان پیدا ہوگئی۔ یہی قصیدہ عربوں کے ساتھ ایران پہنچا اور یہاں اُس نے غزل کو جنم دیا۔ ایرانیوں نے جہاں قصیدے کی تشبیب کو قصیدے سے الگ کر کے غزل کا پیکر تیار کیا، وہاں بعض دوسری اصنافِ سخن مثلاً مثنوی، مسمط، دوبیتی، رباعی اور قطعے کو بھی اپنایا اور رواج دیا۔ مگر ایرانی شعرا نے غزل پر ہی اپنی بیشتر قوتیں صرف کیں، اور پھر غور کیا جائے تو مثنوی اور رباعی جیسی اصنافِ سخن کی ترقی بھی دراصل غزل کی ترقیوں اور بالیدگیوں ہی کا عکس تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک ایرانی شاعر غزل کے ساز وسامان سے مدد نہیں لیتا، مثنوی، رباعی یا قطعے میں کوئی حقیقی شاعرانہ حسن پیدا نہیں ہوتا اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا شاید نامناسب نہ ہو کہ فارسی شاعری کی اصلی ترقی عبارت ہے غزل کے نشو ونما اور ارتقا سے، اور ایرانی شاعری کی تمام اصناف نہ صرف اپنی ترقی بلکہ اپنے وجود وبقا کے لئے غزل ہی کی مرہونِ منت رہی ہیں۔

فارسی غزل کا ارتقا عباسیوں کے عہد میں اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلامی فن وثقافت کے ارتقا کے ساتھ اپنے عروج کو پہنچا، اور یہی عروج یافتہ اور فروغ یافتہ غزل وہ تناور درخت تھا جس کی قلم ہندوستان میں لاکر لگائی گئی۔

اردو شاعری کو اپنے سفر کے سب سے پہلے مرحلے پر ہی ایسے بھرپور اور مکمل زادِ راہ کا میسر آجانا وہ امتیاز تھا جو اردو کے سوا کسی دوسری زبان کے حصے میں نہیں آیا۔ دنیا کی مختلف زبانوں اور ان زبانوں کے ادب کا تاریخی مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہر زبان کی شاعری کا ارتقا ایک طرف خود اس زبان کے لسانی پہلوؤں کے ارتقا اور دوسری طرف اس زبان کے بولنے والوں کے ذہنی اور کلچری ارتقا کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتا ہے۔ اس طرح ہر زبان کی شاعری اپنے ابتدائی دور میں (اور یہ دور بالعموم کئی کئی صدیوں کے طویل زمانے کی عبارت ہوتا ہے) جذبات و خیالات اور بیان و اظہار کے نہایت کھردرے، ناپختہ اور ناہموار نمونوں پرمشتمل ہوتی ہے۔ اس طویل زمانے میں شاعری ایک طفلانہ اور معصومانہ سادگی کے سوا کوئی دوسری علمی، ادبی خصوصیت اپنے اندر پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ فارسی شاعری کے گراں بہا عطیے کی بنا پر اردو شاعری کا یہ ابتدائی دورِ طفولیت بہت ہی مختصر ہو گیا۔ محمد قلی قطب شاہ سے ولی تک اور ولی سے میر تک کوئی بہت طویل مدت نہیں ہے پھر اردو کے ابتدائی شاعروں کے کلام میں وہ کچا پن نہیں جو دوسری زبانوں کے ابتدائی شاعروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ خود فارسی نے جو پختگی اور رچاؤ کم سے کم سات آٹھ صدیوں میں پیدا کیا تھا وہ اردو شاعری نے زیادہ سے زیادہ دو صدیوں میں حاصل کر لیا۔ اس کا سبب اگر ایک طرف گلِ رعنا کے مصنف کے الفاظ میں یہ تھا کہ اردو شاعری کی ابتدا فارسی شاعری کی انتہا سے جا ملی ہے، تو دوسری طرف یہ کہ خود ہندستان کے رہنے والے اردو شاعری کے آغاز کے وقت ذہنی و تمدنی ارتقا کی معراج کو پہنچ چکے تھے اور خود ہندستان میں ایسے لوگ موجود تھے جو نہ صرف عربی فارسی کی روایات پر عبور رکھتے تھے بلکہ ہندستان کے سنسکرتی ادب اور یہاں کے گانوں اور بولیوں کو اپنے کلچر کا جزو بنا چکے تھے۔

غزل کی صنف جو ایران کی شاعری سے ہمارے ہاتھوں تک پہنچی تھی ایک زندہ صنف تھی اور زندگی کے امکانات سے بھرپور تھی۔ اور کہنے کی بات یہ ہے کہ ہم نے نہ صرف اس کی زندگی کو برقرار رکھا، بلکہ اس کو نئے مقامات اور نئی منازل سے گزارا۔ ہم نے ایک غیر ملکی اور اجنبی صنفِ سخن کو پوری طرح اپنا لیا، اور اپنے ذوقِ شعر اور احساسِ حُسن کے ساتھ اسے پورے طور پر ہم آہنگ کر لیا۔ ہم نے ایرانی شاعروں کی آواز میں اپنی آواز کا اضافہ کیا۔ ہم نے قدیم اور کلاسیکل استعاروں اور علامتوں کو رسمی و روایتی مضامین کے علاوہ اپنے مخصوص احساسات، تصورات، اور تجربات کے اظہار کا بھی ذریعہ بنایا۔ ہم نے قدیم ایرانی تغزل کے نغموں میں نئی گونجیں، نئی تانیں، نئی گہرائیاں اور نئی تہیں پیدا کیں۔ ہم نے اپنے ہزاروں لاکھوں رسم پرست اور تقلید پرست شعرا کی فرسودہ نوائی اور مبتذل نگاری کے باوجود غزل کو ایک نیا لب و لہجہ دیا، نئے کس بل سے مسلح کیا، اور نئے رنگ آہنگ سے آراستہ کیا۔ مختصر یہ کہ ہم نے ایک قدیم اور رواجی صنفِ سخن کو بڑی حد تک اپنے ماحول، اپنے حالات، اپنی ذہنیت اور اپنے مزاج کا ترجمان بنایا۔ اور یوں تین سو سال سے غزل ہماری شاعرانہ سرگرمیوں کا مرکز، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہماری شاعری کے قطب نما کے لئے ستارۂ قطبی بنی ہوئی ہے اور بری طرح یا بھلی طرح ہمارے فکری و ذوقی، فنی و جمالیاتی، اور ذہنی و کلچری مطالبات کو آسودہ کر رہی ہے۔

ہمارے ہاتھوں میں پہنچنے کے بعد غزل متعدد ادوار، اور بے شمار تغیرات سے گزری ہے۔ اردو غزل نے میرؔ، دردؔ، اور سوداؔ کا زمانہ بھی دیکھا ہے، اور انشاؔ، مصحفیؔ، اور جرأتؔ کا دور بھی۔ ناسخؔ، شادؔ، نصیرؔ اور ذوقؔ کی فنی مہارت کے خراد پر بھی چڑھی ہے، اور آتشؔ، غالبؔ اور مومنؔ کی گہرائیوں سے بھی سیراب و شاداب ہوئی ہے۔ داغؔ و جلالؔ کے ہاتھوں میں بھی کھیلی ہے اور امیرؔ و اسیرؔ کی بزم آرائیوں میں بھی آرائش و تکلف کے ساز و سامان سے بنائی، سنواری اور چمکائی گئی ہے۔ اس میں رسمی و تقلیدی مضامین کی بھی بھرمار رہی ہے اور نئے اور اچھوتے خیالات کی فراوانی بھی۔ یہ اولیائے کرام کے روحانی پیغام کا ذریعہ بھی بنی ہے اور بدمستوں اور بوالہوسوں کی ہوس ناکیوں اور لذت پرستیوں کی

اظہار کا آلہ بھی۔ اس میں عشق، رومان اور فرار کے راگ بھی الاپے گئے ہیں اور قومیت و وطنیت کے گیت بھی گائے گئے ہیں فلسفہ و حکمت کی گتھیاں بھی سلجھائی گئی ہیں، اور سماج و سیاست کے مسائل بھی پیش کئے گئے ہیں۔ غرضکہ اردو غزل آمد و آورد بلند و پست مرتلخ و شیریں، داخلیت و خارجیت، رکاکت و متانت، مادیت و روحانیت، واقعیت و تخئیلیت اور ارضیت و ماورائیت کا ایک عجیب غریب، حسین و جمیل، رنگا رنگ، پر بہار اور پر اسرار مجموعہ ہے۔

دکن کے عادل شاہی اور قطب شاہی شاعروں کے زمانے سے لیکر غالب و شیفتہ کے زمانے تک غزل بلا شرکتِ غیرے ہماری شعر و شاعری کی مملکت پر متصرف و قابض رہی۔ اس کی مقبولیت یا ہر دلعزیزی میں کسی کو کلام نہ تھا، اس کی اقتدار کی ہمہ گیری اور شش جہتی مسلّم تھی۔ پھر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ رونما ہوا۔ اس تحریک میں ترقی پسندانہ عناصر بھی تھے۔ اور رجعت پسندانہ بھی۔ یہ ہندستان کے نئے اور ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کی بغاوت تھی، سیاسی محکومیت اور اقتصادی غلامی کے خلاف ــــ یہ اس کا ترقی پسندانہ پہلو تھا۔ یہ قدیم معتقدات، فرسودہ روایات، اور عہد جاگیرداری کے تعصبات کی بغاوت تھی نئے خیالات، نئے تصورات اور نئی تہذیبی اقدار کے خلاف ــــ یہ اس کا رجعت پسندانہ پہلو تھا۔ بغاوت ناکام رہی۔ سیاست و اقتصاد کی دنیا میں ترقی کو شکست ہوئی اور رجعت نے سرخ روئی حاصل کی۔ عقائد و اقدار کی دنیا میں ارتجاعی قوتوں نے منہ کی کھائی، اور ترقی پسندی و روشن خیالی کو فتح اور کامرانی نصیب ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان میں نئے خیالات کا دھارا بہہ نکلا۔ علم، ادب اور آرٹ کے قدیم تصورات پر جدید تصورات حملہ آور ہوئے، اور آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر یہ احساس پھیلتا گیا کہ شعر و ادب کے کارناموں میں زندگی کے خارجی کوائف اور ٹھوس، مادی اور اصلی حقائق کو بیش از بیش اہمیت حاصل ہونی چاہئے۔ یہ احساس دراصل مغربی شعر و ادب کی واقعیت، ارضیت، سلاست اور تنوع کا پیدا کیا ہوا تھا۔ اسی احساس نے اگر ایک طرف جدید اردو نظم کی بنیاد ڈلوائی، تو دوسری طرف غزل کے خلاف پہلی بغاوت کو جنم دیا۔ حالی ایک ٹھنڈے مزاج اور معتدل و متوازن طبیعت کے ادیب تھے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ اردو کے پہلے باقاعدہ نقاد تھے، مگر اس کا احساس شاید سب کو نہ ہوگا کہ اردو کی ادبی تنقید میں جس بصیرت و شعور کا ثبوت انھوں نے دیا، وہ آج پچاس سال گزر جانے پر بھی اور شعر و ادب اور نقد و نظر اور تصنیف و تالیف کے تمام تر غلغلے کے باوجود ہماری تنقیدی سوجھ بوجھ کی آخری حد ہے۔

حالی نے اردو غزل کی جو فردِ جرم تیار کی ہے وہ بے حد طویل ہے۔ مگر اس کا لب لباب یہ ہے کہ ہماری شاعری اپنی فطری حالت سے تنزل کرکے رکاکت، تصنع، بے کیفی و بے اثری، مبالغہ و افترا، ہزل و تخریب اور صنعت و بدائعت کی پستیوں میں جاگری ہے۔ ذرا زیادہ تعمق سے کام لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حالی نے بالخصوص غزل کو نہیں بلکہ بالعموم دورِ انحطاط کی ساری اردو شاعری کو جو شعرائے متاخرین کی پیداوار تھی، اپنے اعتراضات کا ہدف بنایا ہے حالی نے اردو شاعری کے بھی و تقلیدی عناصر اور فرسودہ اور روایتی پہلوؤں کے خلاف آواز اٹھائی اور بس! اور ان کا یہ احتجاج برحق تھا۔ انیسویں صدی میں ہماری شاعری چند مخصوص فنکاروں کے مخصوص کارناموں کو چھوڑ کر ایک کردار اور بے جان ڈھانچے کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ایک ترقی پسند اور تغیر پذیر جسد نہ رہی تھی اور اس میں ایک ایسا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا جو تعفن اور کثافت کے سوا کوئی دوسری چیز پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت ہماری شاعری کو یقیناً حالی جیسے مصلح و پیغمبر اور معمار فن کی ضرورت تھی۔ اور حالی کی تخریب و تعمیر نے ہماری بیمار شاعری کو یقیناً تندرستی بخشی، اور ایک نئے دورِ صحت کا آغاز ہوا۔ جدید نظم کی ترقی کے ساتھ ساتھ غزل نے بھی اپنے جمود کو توڑ کر کچھ قدم آگے بڑھائے۔ شعر لکھنے والوں اور شعر کے مطالعے سے لطف اندوز ہونے والوں میں غزل کی مقبولیت کمتر تو ضرور ہو گئی، مگر تاثیر،

افادیت اور سلامت کے لحاظ سے اس کا معیار پہلے سے اونچا ہو گیا۔ غزل کے اِس نشاۃِ ثانیہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف تو ادب و فن کے ایک صحیح تر اور صالح تر تصور کی روشنی میں بعض قدیم غزل گو شعرا مثلاً مصحفی، آتش، غالب اور مومن کی قدریں دوبارہ متعین کی گئیں، اور دوسری طرف فانی، اصغر، حسرت اور اقبال نے غزل میں ایک نئی معنویت، ایک نیا وزن، ایک نئی بلاغت پیدا کر کے اس کو بیسویں صدی کے ذوق سے قریب تر کر دیا اور ایک جنسِ گراں مایہ تر کی حیثیت بخشی۔

مقدمۂ شعر و شاعری کی اشاعت کے بعد تقریباً چالیس سال تک غزل کی تجدید و احیاء کا یہ کام جاری رہا اور حالی کی تحریک کی طرح کوئی منظم بغاوت غزل کے خلاف برپا نہیں ہوئی۔ لیکن سنہ ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ پھر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور یہ کافی طویل اور متنوع ثابت ہوا۔

سب سے پہلے جوش ملیح آبادی نے غزل کے موضوعی انتشار کو اپنی مخالفت کا نشانہ بنایا۔ انھوں نے مسلسل و مربوط غزل کی حمایت کی۔ یہ کوئی نیا تصور نہیں تھا، کیونکہ قدیم غزل گو شعرا کے کلام میں بکثرت ایسی غزلیں ملتی ہیں جن میں موضوعی یگانگت اور تسلسل خیال پایا جاتا ہے۔ لیکن جوش نے غیر مربوط غزل کی مخالفت اِس شدت کے ساتھ کی کہ ان کے اِس رجحان نے ایک اچھی خاصی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو غزل میں اندرونی ربط و تسلسل پر اصرار کرنا ایک بے معنی سی بات ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ اعتراض ہی غلط ہے کہ غزل کے اشعار میں بے ربطی اور پراگندگی پائی جاتی ہے۔ غزل کا ہر شعر بجائے خود مکمل ہوتا ہے، لیکن اِس عدمِ تسلسل کے باوجود غزل کا ایک مخصوص ماحول ہوتا ہے اور اس ماحول یا فضا کے اعتبار سے مختلف اشعار میں ایک نوع کی یک رنگی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اِس ہم آہنگی کو ناکافی سمجھ کر ایک مصنوعی اور میکانی قسم کی ہم آہنگی پر اصرار کرنا غزل کی روح کو کچلنے کی کوشش کے مترادف ہے۔ اگر غزل کا ایک شعر محبوب کے حسن و جمال کے بارے میں ہو، دوسرا تاج محل کے متعلق ہو، اور تیسرا کسی سیاسی تحریک کے سلسلے میں، تو بے شک غزل پر بے ربطی کا الزام لگانا درست ہوگا۔ لیکن موجودہ حالت میں یہ الزام کوئی وزن نہیں رکھتا۔ ہزاروں لاکھوں عشقیہ غزلوں کے علاوہ جدید وضع کی غزلیں مثلاً اکبر کی بعض سماجی غزلیں اور اقبال کی بعض سیاسی غزلیں اس امر کا بیّن ثبوت ہیں کہ غزل میں تسلسلِ خیال اور ارتقائے خیال کے فقدان کے باوجود مختلف اشعار ایک مخصوص ماحول کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں اور اس یک رنگی کے ہوتے ہوئے بے ربطی اور پراگندگی کا الزام بالکل بے بنیاد ہے۔

جوش نے اپنے عقیدے کا عملی ثبوت بھی دیا ہے، یعنی کثیر تعداد میں مسلسل غزلیں لکھی ہیں۔ یہ مسلسل غزلیں جوش کے بہار آفریں تخیل کی پیداوار ہونے کی حیثیت سے نہایت شاندار شعری کارنامے ہیں، مگر یہ امر کہ غزل کے مختلف اشعار میں ایک ہی خیال کو بار بار مختلف پیرایوں میں پیش کیا جاتا ہے نہ صرف اُن غزلوں کی قدر و قیمت کو کم کر دیتا ہے، بلکہ جوش کی اِس اصلاح کو غیر ضروری بھی ثابت کرتا ہے۔ اب اگر اس کے بعد یہ تجویز پیش کی جائے کہ غزل میں اِس تسلسل کے بجائے جو جوش کی مسلسل غزلوں میں پایا جاتا ہے خیال کا ارتقا اور نشو و نما ہونا چاہیے تو یہ تجویز بھی قابلِ قبول نہ ہوگی، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ غزل کی صنف کو ختم کر دیا جائے اور صرف نظمِ مسلسل کو باقی رکھا جائے۔ حالی نے اپنے اعتراضات کے مرتب کرنے میں یقیناً زیادہ گہرے تنقیدی شعور سے کام لیا تھا۔ اُنھوں نے غزل کی خارجی ہیئت سے کوئی تعرض نہیں کیا اور صرف غزل کے مضامین تک اپنے اعتراضات کو محدود رکھا۔ جوش کے نقطۂ نظر کو کسی تنقیدی شعور کا نتیجہ نہیں بلکہ اُن کے شاعرانہ مزاج کا بانکپن سمجھنا چاہیے۔

اعتراضات کے اِس سلسلے کی دوسری کڑی ڈاکٹر عندلیب شادانی کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے "دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی" کے عنوان سے سنہ ۱۹۳۰ء میں لکھنے شروع کیے۔ یہ مضامین اردو غزل پر بڑی سخت، نہایت درجہ یک رخی مگر بڑی پتی تنقید کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لکھنے والے کی پیہم اور شدید مخالفت اور بے رحمانہ صاف گوئی نے پڑھنے والوں میں ایک ہیجان

پیدا کر دی اور عام طور پر ان مضامین کو ایک غیر متوازن نقاد کی منفعت نگاری سے تعبیر کیا گیا۔ لیکن اس تنقید کے حقیقی وزن سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انیسویں صدی کے اواخر تک کی غزل کو حالی اپنی تنقید کا موضوع بنا چکے تھے اس لئے شادانی نے بیسویں صدی کے غزل گو شعرا یعنی حسرت، اصغر، فانی اور جگر کے کلام تک اپنے مطالعہ کو محدود رکھا، اور شادانی کے اعتراضات دراصل حالی کے اعتراضات ہی کا اعادہ تھے۔ یعنی شادانی نے بھی غزل کے رسمی و تقلیدی عناصر کے خلاف احتجاج کیا۔ اُن کے مضامین سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ دورِ حاضر کی غزل ادوارِ گذشتہ کی غزل سے بہت مختلف اور ترقی یافتہ ہوتے ہوئے بھی بے شمار روایتی عناصر اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے اور اس میں شکست وریخت کی ابھی بے حد گنجائش ہے۔

پروفیسر کلیم الدین نے اپنی کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" [1] میں غزل پر جو اعتراضات کئے ہیں وہ بھی اس نئے سلسلۂ اعتراضات کی ایک کڑی خیال کئے جا سکتے ہیں۔

دوسری اصنافِ سخن کی طرح سماجی ماحول کی شعوری عکاسی کرنی چاہئے، اور اس دور کی اجتماعی زندگی کے مطالبات سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ یہی وہ صحیح ترین تنقید ہے جو اب تک غزل پر کی گئی ہے، اور یہی وہ بہترین خطوط ہیں جن پر آئندہ غزل کا ارتقا ہو سکتا ہے۔

---

[1] پروفیسر صاحب کی یہ کتاب غالباً اُن کے مطالعہ و فکر کے ابتدائی زمانے کی یادگار ہے، کیونکہ ناقص اور پھیکی زبان کے ساتھ خیالات اور رایوں کا ادھکچرا پن ہر جگہ نمایاں ہے۔ کتاب کے کچھ حصے ایسے ہیں جن کو متوازن تنقید کا نام دیا جا سکے۔ پروفیسر صاحب نے کسی جگہ مجاز پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُن کی ذہنیت اس طالبِ علم کی سی ہے جس نے ابھی بی، اے پاس نہیں کیا اگر اس اندازِ نقد کی پیروی کی اجازت ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کا پڑھنے والا بے اختیار یوں محسوس کرتا ہے کہ مصنف نے ابھی حال ہی میں بی اے پاس کیا ہے۔ وہ چند باتیں ایسی ہیں جن کو پروفیسر صاحب طوطے کی طرح رٹتے ہیں۔ مثلاً شعرا کے بارے میں جگہ جگہ "شخصیت معمولی، ذہن واجبی ادنیٰ، دماغ اوسط درجے کا، تخیل معدوم، قوتِ خلاقہ مفقود" کا فیصلہ صادر فرماتے چلے گئے ہیں۔ اور آزاد، حالی، اور شبلی بھی اس تعریف سے نہیں بچے ہیں۔ پھر مختلف زیر بحث نظموں کے متعلق اعتراض جگہ جگہ ملتا ہے اور اپنی پیہم تکرار سے طبیعت کو متعفن کرتا ہے کہ "ان اشعار میں انتشار ہے، پراگندگی ہے۔ ایک شعر دوسرے شعر کا محتاج نہیں ہے۔ ارتقائے خیال مفقود ہے۔ اشعار کی ترتیب میں رد و بدل ممکن ہے۔ اگر بیچ میں سے شعر حذف کر دیئے جائیں تو مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا"۔ ایک اور چیز جس سے کتاب کا پڑھنے والا بار بار دوچار ہوتا ہے مختلف نظموں کے بارے میں مصنف کی یہ شکایت ہے کہ "ان میں نثریت غالب ہے، شعریت کا پتہ نہیں۔ خیالات محض اور جذبات محض ہیں، شاعرانہ خیالات اور شاعرانہ جذبات نہیں ہیں"۔ ان چیزوں کے علاوہ کتاب میں اکثر مقامات پر بڑی چونکا دینے والی رائیں ملتی ہیں۔ حالی کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ مصلح قوم تھے، مگر اُن میں شاعر ہونے کی صلاحیت مطلق نہ تھی، اور مسدس کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ یہ مثل ریگستان کی ہے اور یہ کہ اس میں ہر جگہ نثر کی جلوہ گری ہے اور شعریت معدوم ہے۔ طلوعِ اسلام بھی اُن کے نزدیک شاعری نہیں۔ زبان پر قدرت کا یہ عالم ہے کہ بسا اوقات جو کہنا چاہتے ہیں اس کے لئے مناسب اور صحیح الفاظ نہیں ملتے۔ مثالیں بے محل [illegible] کیونکہ یہاں اس کتاب پر تبصرہ مقصود نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ جس شخص کی تحریر و تنقید کا یہ عالم ہو اس کے اعتراضاتِ غزل یا کسی بھی چیز پر کیا اہمیت رکھ سکتے ہیں۔

ان اعتراضات میں ایک تو وہی بے ربطی اور عدم تسلسل والا اعتراض ہے جس پر ابھی گفتگو ہو چکی ہے۔ دوسرے ایک جگہ پروفیسر صاحب نے یہ لکھا ہے کہ غزل ایک نیم وحشی صنفِ سخن ہے۔ پروفیسر صاحب تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے۔ نہ اس کی تفصیل پیش کی نہ دلائل فراہم کئے۔ مگر ہنگامہ پسندوں کو گرمیٔ بازار قائم رکھنے کے لئے ایک نیا ذریعہ مل گیا۔ اب اس اعتراض کی چھان بین کی جائے تو طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اوّل تو وحشت اور تہذیب کے معیار قائم کرنے ہوں گے۔ پھر یہ تحقیق لازم آئے گی کہ معترض نے غزل کو اس کی معنوی حیثیت کے لحاظ سے نیم وحشی قرار دیا ہے یا ظاہری ہیئت کے اعتبار سے۔ ممکن ہے اس خیال سے بھی بحث میں الجھن پیدا ہو کہ بعض لوگوں کے عقیدے میں شاعری وحشت و بربریت یا جہل و تاریکی کے ماحول ہی میں فروغ پاتی ہے۔ غرضکہ اس مبہم اعتراض پر کوئی مفید مطلب گفتگو نہیں کی جا سکتی۔

ان مختلف شاعروں اور ادیبوں کے اعتراضات کے ساتھ ساتھ مختلف گوشوں سے وقتاً فوقتاً غزل پر ایرانی شاعری کی نقالی کا الزام بھی لگایا جاتا رہا ہے۔ مگر یہ اعتراض جتنا وزنی معلوم ہوتا ہے اتنا ہی بے حقیقت ہے۔ جو لوگ زبان و ادب کو ایک زندہ سماجی حقیقت کی حیثیت سے جانتے اور پہچانتے ہیں وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ زبان و ادب نہایت سریع الانفعال چیزیں ہیں۔ نیز یہ کہ ان کو متاثر کرنے والی قوتیں برابر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی ہیں، اور کسی زبان یا ادب کے دروازے ان پر بند نہیں کئے جا سکتے۔ زبان اپنی نوعیت کے لحاظ سے چیز ہی ایسی ہے کہ وہ قطعی طور پر نئی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہر نئی زبان جو پیدا ہوتی ہے اپنے سے قبل کی ایک یا ایک سے زیادہ زبانوں کی مختلف اور بدلی ہوئی شکل ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر زبان ہر وقت اور ہر حال میں اور اپنی زندگی کے ہر مرحلے پر دوسری زبانوں سے متاثر اور مستفید ہوتی ہے۔ یہ اس کی نوعیت اور اس کی فطرت کا تقاضہ ہے۔ اس اثر پذیری اور استفادہ کو نقالی کہنا زبان کی اصل و سرشت سے ناواقفیت کا ثبوت بہم پہنچانا ہے۔ اردو جن حالات میں پیدا ہوئی ان حالات میں اس کے سوا کچھ اور کر ہی نہیں سکتی تھی کہ فارسی، عربی اور ہندوستان کی مختلف زبانوں اور بولیوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ یہ نقالی نہیں تھی، وجود پذیری تھی۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ یہ حالی کی تحریک کے بعد اردو ادب میں دوسری جاندار احتجاجی تحریک تھی۔ یہ تحریک ایک منظم، واضح اور سلجھا ہوا نظریۂ ادب اپنے جلو میں لئے ہوئے اٹھی۔ اس نظریۂ ادب کی روشنی میں پچھلے تمام اردو ادب کے متعلق جو رائے قائم کی گئی اور آئندہ کی ادبی کاوشوں کے لئے جو راہیں متعین کی گئیں ان سب کا اطلاق غزل پر بھی ہوتا ہے۔ گویا ترقی پسند نظریۂ ادب کی رو سے غزل اب تک ایک عیش پرستانہ اور زوال آمادہ جاگیردارانہ سماج کی شاعری رہی ہے۔ اس میں ایک فارغ البال استحصالی طبقے نے اپنی زندگی کے چند فاسد اور سقیم رجحانات کی ترجمانی کی ہے۔ ایک طرف تو عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں پرورش پانے والی شکست خوردہ ذہنیت نے دنیا کی بے ثباتی کے راگ الاپے ہیں، اور دوسری طرف مادی تعیش کے پرستاروں نے رومان، تعشق، اور جنسی ترغیبات کے گیت گائے ہیں۔ دونوں حالتوں میں غزل کی شاعری فراری، انفرادی اور انحطاطی رہی ہے۔ سماج کے حقیقی اور بنیادی مسائل کی ترجمانی اس میں کبھی نہیں ہوئی۔ اجتماعی شعور سے یہ ہمیشہ بیگانہ رہی۔ ظاہر ہے کہ اس تنقید میں غزل کی خارجی ساخت اور ہیئت سے کوئی بحث نہیں کی گئی ہے۔ اس کا سبب یہ کہ ادب میں ترقی پسندی کا نظریہ مواد اور موضوع سے تعلق رکھتا ہے، ہیئت اور خارجی طرز سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ ترقی پسندوں کے عقیدے میں غزل کی ساخت پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ ان کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ غزل کو

(باقی صفحہ ۷۶ پر ملاحظہ فرمائیے)

ڈاکٹر مسعود حسین

ہندی × ہندوستانی

ابھی کل کی بات ہے ہم میں سے کتنے ہندی کو ایک گنوارو بولی خیال کرتے تھے اور آج اسی کے مسلط کر دیئے جانے پر کتنے اردو کے مستقبل سے ہراساں نظر آرہے ہیں۔ اردوئے معلّٰی کے کچھ ہٹیلے پرستاروں نے زبان کے مسئلہ پر بے لاگی سے سوچنے ہی نہ دیا۔ نیز کچھ ہندی کے بعض اہل پریمی آج اردو کے بارے میں کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتے!

دونوں ہی طرف ضد اور ہٹ ہے۔ یہ کون بتائے کہ کس طرف بے جا ہٹ ہے اور کس طرف راج ہٹ ہے تھوڑی سے بے لاگ ہو کر سوچیے تو نہ ہندی ہی کبھی گنوارو بولی تھی اور نہ ہی اردو کوئی چھوٹی موئی ہے۔ زبان کی گتھی کو اگر دل کی بجائے دماغ سے سلجھایا جائے تو بڑی آسانیاں پیدا ہو جائیں۔ ہندی کے ارتقا کو اگر آپ تاریخی پس منظر کے ساتھ دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ آسمانوں سے نہیں ٹپک پڑی ہے۔ آنجہانی پنڈت رامچندر شکل ہندی اور دوسرے بھی کو ہندی کے قدیم نسخوں سے زبردستی کڑیاں ملانے اور یہ بات ثابت کرنے کی مطلق ضرورت نہیں کہ ہندی فورٹ ولیم کالج سے پہلے بھی موجود تھی۔ ہندی کے تسلسل کو سنسکرتیت کے اس رجحان میں ڈھونڈھنا چاہئے جسے فارسی پوری طرح کبھی زیر نہ کر سکی تھی ہندوستان کی تمام بولیاں اسی سوتے سے سیراب ہوتی رہی ہیں۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ جب بھی ہندوستان کی کسی بولی نے ترقی کرنا چاہی ہے اسے یہاں کی کلاسیکل زبان یعنی سنسکرت کا سہارا لینا پڑا ہے یہی حال بنگالی کا ہے یہی حال مرہٹی گجراتی کا ہے صرف یوپی اور اس کے اطراف میں فارسی کی اتنی گہری چھاپ پڑی تھی کہ جب یہاں کی ایک بولی یعنی دہلی کے آس پاس کی ہندوستانی نے چمکنا چاہا تو فارسی عربی کا سہارا لیا۔ کچھ اسی قسم کا رجحان آپ کو سندھی، پنجابی، کشمیری اور پشتو میں مل جائے گا جو ابھی تک زبان کا درجہ حاصل نہیں کر سکی ہیں، لیکن جن کا فطری میلان فارسی عربی ہی کی طرف ہے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کی بعض بولیاں سنسکرت کے سہارے اور بعض بولیاں فارسی عربی کے بل پر زبانوں کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ ہندوستانی بولی شروع شروع میں فارسی ہی کی گود میں اردو کے نام سے پلی بڑھی فارسی نے کچھ عرصے کے لئے سنسکرت کا فسوں شمالی ہند کے بہت بڑے علاقے میں توڑ دیا تھا۔ اسی لئے جب یوپی اور بہار کی بولیوں نے اس کی انگلی چھوڑ دی تو اس نے بنگالی، گجراتی، مہاراشٹر اور اڑیسہ کی دور افتادہ صوبائی بولیوں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں یہ بات ایک لمحے کے لئے بھی ماننے کو تیار نہیں کہ ان علاقوں میں سنسکرتیت کی تحریک کسی خاص فرقہ وارانہ جذبے کے تحت ہوئی ہے۔ بنگال میں تو مسلمانوں کی کثرت تھی۔ انھوں نے اپنی بولی کو اس کے سہارے کیوں پروان چڑھنے دیا۔ دراصل بنگالی زبان کے لئے پھولنے پھلنے کا اور کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ آج بھی بنگالی میں تقریباً پانچ ہزار عربی فارسی کے لفظ گھلے ملے پائے جاتے ہیں لیکن مشرقی بنگال کے باشندوں کے لئے اب بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنی زبان کو سنسکرت ہی کی اصطلاحوں سے مالامال کریں۔ یہی حال گجراتی مرہٹی، اڑیا اور آسامی کا ہے۔ ان سب کا ایک مشترک سوتا ہے۔ اور شاید اسی بنا پر ان کی علمی اور اصطلاحی زبان ایک دوسرے کے قریب تر آتی جا رہی ہے۔

ترقی کرنے کا جو راستہ بنگالی نے دکھایا فورٹ ولیم سے وہی ہندوستانی نے اختیار کیا۔ مشرقی یوپی اور بہار کے ایک بڑے طبقہ میں سنسکرت پرستی کا احساس اردو کے دور شباب میں بھی قائم رہا ہے۔ گو خاص حالات میں یہ تہ نشین ہی رہا انگریزی

سیاست نے اس صدیوں کے دبے ہوئے سلگتے احساس پر پنکھا جھلا۔ رفتہ رفتہ نچلے طبقے کی بیداری کے ساتھ ساتھ ہندی پرچار کی تحریک قومیت کا لازمی جزو بن گئی۔

لیکن میں ذرا اونچی آواز سے یہ کہوں گا کہ یوپی بہار اور مشرقی پنجاب کی تاریخ تمدن بنگال یا گجرات سے قدرے مختلف رہی ہے۔ یہی علاقہ ہے جو پچھلے زمانے کے ہندو مسلم کلچر سے سب سے زیادہ متاثر رہا ہے۔ شاید اسی نئے کلچر کے زیر اثر یہاں کی بولیوں نے سنسکرت کی بجائے فارسی کا سہارا لینا پسند کیا۔ چنانچہ سنسکرتیت وہ تحریک جو بنگالی یا مرہٹی کے لئے عین فطری دکھائی دیتی ہے، یہاں کے لوگوں کم از کم یوپی اور مشرقی پنجاب کے باشندوں کو اجنبی سی معلوم ہوتی۔ میں یہ نہیں کہتا وہ یہاں کے لئے غیر فطری ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو تاریخ کی کڑیوں کو ملا کر شبدھ نکات کے مدعی ہیں یہ بات بھی نہیں کہہ سکتے کہ اردو کا ارتقا غیر فطری انداز پر ہوا ہے۔ یا اگر یہاں کی کوئی بولی فارسی کا سہارا لے تو وہ غیر ہندی ہوجائے گی۔ اردو ہندی دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے لئے آکاس بیل نہیں۔ ایک ہی بنیادی بولی یعنی ہندوستانی دو مختلف کلاسیکل زبانوں کے ذریعہ نشوونما پارہی ہے۔ یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو دونوں زبانوں کی مہارت حاصل کرنا چاہئے اور زبان کی دونوں بیلوں کو ایک دوسرے سے گتھا رکھنا چاہئے۔

لسانیات کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے مجھے نہ تو کسی اخلاقی نقطۂ نظر سے ہندی کے ارتقا پر حکم لگانے کی ضرورت ہے اور نہ اس سے بحث ہے کہ اس صوبہ کی آئندہ زبان کیا ہونی چاہئے۔ میں تو صرف اس بات سے بحث کر سکتا ہوں کہ ہندی کی آئندہ نوعیت کیا ہوگی۔ یہ نہ تو موجودہ اردو ہوگی جو جدید آبادی کے طبقوں سے دور جا رہی ہے اور نہ ہندی کی وہ مسخ شدہ شکل جو بدحواسی کے عالم میں اور ایک وقتی جذبے کے تحت آج عام کی جا رہی ہے۔ اس کے خلاف ترقی کی طاقتیں جمع ہو رہی ہیں۔ یہ کانفرنس گوشۂ زنجیر کی پہلی جنبش ہے۔

مجھے یہ بات کہنے میں ذرا باک نہیں کہ یہاں کی قومی زبان سنسکرت سے آنچل بچا کر بھی نہیں رہ سکتی۔ لیکن الٹی گنگا بہانا بیکار ہے۔ تاریخ تمدن کی کسی بھی کڑی کو آپ نکال کر نہیں پھینک سکتے۔ ہندوستانی کا اردو روپ ایک خاص تاریخی کڑی کی ضمانت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھئے کہ ہمارے سماج کے سنگ دشت جو آج نہیں تو کل تاج و تخت کے مالک ہوں گے کسی ایسی لسانی تحریک کا ساتھ نہیں دے سکتے جس میں سورج کو سوریہ۔ سنگھار کو شرنگار سچ کو ستیا، ورحمن کو یمنا کہنے کا رجحان ہو۔ ذرا سورداس اور میرابائی کے دوہوں میں جمنا کی جگہ یمنا رکھ کر پڑھئے تو اور پھر دیکھئے کہ ذوق لطیف کا کتنا کثیف طمانچہ آپ کے منہہ پر پڑتا ہے۔

آخر میں، قومی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد ہمیں بین الاقوامی مانگوں کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔ محض پروا اور پچھوا ہواؤں ہی سے ہماری قومی زندگی کی کھیتی نہیں لہلائے گی۔ اس کے لئے ہمیں دور دراز کی شمالی مغربی ہواؤں پر بھی اپنے دریچے کھولنا پڑیں گے۔

قومی زبان یعنی ہندوستانی کے سلسلے میں چند تجاویز پیش کروں گا۔ ان سے شاید کسی ایک فرقہ یا جماعت کی تشفی تو نہ ہو سکے لیکن سب کی مل کر ضرور ہو جائے گی۔

میں ہندوستانی زبان کو چار حصوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) زبان کا پہلا حصہ بنیادی ہندوستانی کہلائے گا۔ یہ ہندوستانی ہندوستان کی کل کی زبان ہوگی۔ جنوبی ہندوستان اور بنگال کے باشندوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت ہوگی کہ اس کی گرامر سہل بنائی جائے۔ یعنی جمع و واحد اور حالت کی پیچیدگیوں کو صاف کر دیا جائے۔ حروف کے استعمال میں جو نزاکتیں ہم دکھاتے ہیں وہ بھی بنیادی ہندوستانی

کے لئے غیر ضروری ہیں۔ افعال کی شکلوں کو بھی آپ بنایا جا سکتا ہے۔ تذکیر و تانیث کے جھگڑے کو مٹا کر ہم اس زبان کو بنگالیوں، آسامیوں، مدراسیوں، بہاریوں بلکہ پوربیوں تک کے لئے (خاص شہر لکھنؤ کو چھوڑ کر) آسان بنا دیں گے۔ شاید آپ کے علم میں ہوگا کہ ان تمام زبانوں میں تذکیر و تانیث کی کشاکش خوش قسمتی یا بدقسمتی سے نہیں پائی جاتی۔ یہ لوگ تذکیر و تانیث کے معاملے میں اسی وجہ سے قدم قدم پر ٹھوکر کھاتے ہیں اور پچھاں والوں کی دبی مسکراہٹ کا باعث بن جاتے ہیں۔

ان بنیادی اصلاحوں سے ہندوستانی کو کمزور کرنا مقصود نہیں۔ زبان کی سادگی اس کی توانائی ہوتی ہے۔ اس طرح آپ اسے صورت تفصیلی سے صورت ترکیبی میں تبدیل کر دیں گے۔ تمام زبانوں کا ارتقا اسی نہج پر ہوتا آیا ہے۔ اسی قسم کی ہندوستانی آج بھی جنوبی ہند بمبئی اور کلکتے کے بازاروں میں سنائی دیتی ہے۔ یہ زبان جہاں اپنی گرامر کی قید سے سادہ ہوتی ہے، اس میں فارسی عربی کے مروجہ لفظوں کے لئے ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔

(۲) ہماری زبان کا دوسرا روپ یوپی، بہار، دہلی اور مشرقی پنجاب کی گھریلو زبان میں مل جائے گا۔ مشرقی پنجاب اور مغربی یوپی اس کا جنم بھوم ہے۔ لیکن اس نے مشرقی یوپی اور بہار کے علاقوں کو اس طرح مسخر کر لیا ہے کہ یہ بہت بڑے علاقے کی مادری زبان بن گئی ہے۔ مادری زبان کی حیثیت سے اس کی گرامر میں وہ سادگی نہیں ملے گی جس کا ذکر میں ابھی بنیادی ہندوستانی کے سلسلے میں کر چکا ہوں۔ لیکن اس میں بھی لب و لہجہ کے انداز کی گنجائش ہوگی۔ دہلی کی اردو میں اگر ایک چٹک ہوگی تو لکھنؤ کی اردو میں مٹک ہوگی اور بہار کی اردو میں ایک لٹک ہوگی۔ یہ بات میں نے محض قافیہ کی ہٹک میں نہیں کہی ہے۔ آپ بھی اس کے لسانی نکتے سے بخوبی واقف ہوں گے۔ اس علاقے کے ادیب اپنے اسٹائل میں وہ گنگا جمنی بہار دکھائیں گے جو سنسکرت اور فارسی کے ہلکے رنگوں سے تیار ہوگا۔ اس میں سنسکرت کے تت سم خالص الفاظ پر ہندی کے تدبھو (ترقی یافتہ) لفظوں کو ترجیح دی جائے گی۔ اس کی گرامر فارسی سے متاثر نہ ہوگی۔ اس میں عربی زبان کے روڑے بھی نہیں آنے پائیں گے۔ لیکن سنسکرتیت کی کوئی تحریک اس سے ان عربی فارسی لفظوں کو بے دخل نہیں کر سکتی جو اس زمین کے موروثی بن چکے ہیں۔ اس زبان کی حد بندی ایک طرف سنسکرت سے ہوگی تو دوسری طرف فارسی سے۔ اچھا ادیب دونوں سے رنگ اڑائے گا۔ خیالات کے اعتبار سے بھی ہماری زبان کی تکمیل نہ تو صرف سنسکرتی کلچر سے ہو سکتی ہے اور نہ محض ایرانی اور عربی تہذیب سے۔ ہندوستانی کا جلال و جمال ایک ملی جلی تہذیب کی پیداوار ہے جس میں بیک وقت عمل اور تیاگ، پریم اور گیان، اپنایت اور دان، خودی اور بے خودی کے عناصر مل جائیں گے۔

(۳) ہماری زبان کا تیسرا حصہ ان علوم کی اصطلاحوں سے متعلق ہے جو ادب اور زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، مثلاً فلسفہ، تاریخ، سیاست، معاشیات اور قانون وغیرہ۔

اصطلاح سازی کا سب سے آسان طریقہ تو یہ تھا کہ یہ بنیادی ہندوستانی سے بنائی جاتیں۔ لیکن شاید آپ اس سے واقف ہوں گے کہ ہندوستانی، عربی، جرمن، چینی زبان کی طرح تعمیری زبان نہیں ہے۔ اس کا کشکول انگریزی کی طرح مانگے تانگے ہی سے بھرا جا سکتا ہے۔ خود ہندوستانی سے بہت زیادہ اصطلاحیں نہیں بنائی جا سکتیں۔ جو لوگ زبان کے اس غبارے کو اپنی ہی پھونک سے پھلانا چاہتے ہیں وہ اس کی بناوٹ پر بالکل دھیان نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اپنی ناکامی پر عبرت کم اور حیرت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے لئے ہمیں کسی نہ کسی کلاسیکل زبان کا سہارا لینا ہی ہوگا ——— بعض جگہ ہمیں سمجھوتہ بھی کرنا پڑے گا۔ مثلاً قانون کی وہ اصطلاحیں جو آج دیہات تک میں رائج ہو چکی ہیں جن کی

توں قائم رکھی جائیں گی۔ اسلامی علوم اور مذہب کی تمام مروجہ اصطلاحوں کو بھی برقرار رکھنا پڑے گا۔ جہاں سمجھوتہ نہ ہو سکے تو وہاں ہمیں سنسکرت کی ان اصطلاحوں کو اپنا لینا چاہئے جو مشترکہ طور پر بنگالی، مرہٹی اور ہندی میں رائج ہو سکیں۔ سنسکرت کوئی مصیبت نہیں یہ کوئی ہوّا نہیں۔ ہندستانی کے لئے پیر تسمہ یا تو عربی فارسی بھی بن سکتی ہیں۔ اکثر اوقات ہم گتھی کو دہری اصطلاحات سے بھی سلجھا سکتے ہیں۔ علمی دنیا میں کئی زبانوں کی اصطلاحوں کا جاننا ہمیشہ مفید ہی ہوتا ہے۔

(۴) زبان کا چوتھا حصہ ان سائنٹیفک علوم کی اصطلاحات سے متعلق ہے جو بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ان علوم کی اصطلاحات کے لئے فارسی عربی یا سنسکرت کے خزانے کھنگالنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ حیدرآباد کی دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ نے میں سمجھتا ہوں اس بارے میں کوئی نیک قدم نہیں اٹھایا۔ وہ اپنی انتہائی کوشش اور مصارف کے باوجود آپ کو تعجب ہوگا یورپی سائنٹیفک علوم کا صرف ایک فی صدی حصہ اب تک اردو میں منتقل کر سکے ہیں لہٰذا ہمیں ریاضی، کیمیا، اور طبیعیات وغیرہ کی بیشتر بین الاقوامی اصطلاحیں تلفظ اور صوت کی ضروری تبدیلیوں کے ساتھ قبول کر لینی چاہئیں۔

اس طرح فرقہ دارانہ، صوبائی، اور بین الاقوامی تمام مانگوں کو خوبی سے نبھایا جا سکتا ہے۔

آخر میں ایک ٹیڑھا مسئلہ رسم الخط کا رہ جاتا ہے۔ یہاں میں اس سے متعلق ٹکنیکل بحث میں نہیں پڑنا چاہتا ہیں اس سلسلے میں ذاتی طور پر بین الاقوامی کلچر کے تقاضوں کو پورا کرنے کا حامی ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ اس سے ہمارے قومی جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ دیوناگری رسم الخط کے حامی اپنے ترقی یافتہ رسم الخط کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوں گے۔ اس رسم الخط کی تمام خوبیاں ہماری اور آپ کی نظر میں جچی ہیں۔ لیکن ہندوستان میں اس کے علاوہ کئی اور رسم الخط رائج ہیں گے۔ جنوبی ہندوستان کی زبانوں کے رسم الخط کو بدلنے کا کوئی سوال نہیں اٹھتا۔ بنگالی تک اپنے رسم الخط کو عزیز رکھتے ہیں۔ گو، دکھنی اور گجراتی رسم الخطوں کے بھی چہیتے موجود ہیں۔ پھر اردو رسم الخط کو بھی اتنی آسانی سے نہیں ٹالا جا سکتا۔ یہ ہندوستان ہی کا معاملہ نہیں۔ مراکو سے لے کر لاہور تک اور مشرق میں ملایا سے لے کر بورنیو تک یہ اپنی تمام خامیوں کے باوجود اب تک رائج ہے۔ وہاں کے لوگ اسے ہر قیمت پر سدھار اور سنوار کر قائم بھی رکھنا چاہتے ہیں۔

ایسی صورت میں اس ٹیڑھے مسئلہ کا وقتی حل یہی ہے کہ دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخطوں کو برقرار رکھا جائے، اور اصلاح شدہ رومن رسم خط کے لئے رفتہ رفتہ زمین تیار کی جائے۔ وقت کی چھلنی اس مسئلے کو بھی صاف کر دے گی۔

احمد ندیم قاسمی

خاکے[1]

یہ ایک عجیب و غریب حقیقت ہے کہ ان دنوں ترقی پسند شاعروں کے جدید ترین گروہ کے ذہنوں پر ترقیٔ معکوس کا عمل جاری ہے، اور اُردو کی نئی شاعری کے علمبرداروں نے نوجوان شعراء کو نئی امکانات کی وسعتوں پر چھا جانے کے لئے جس اُفق کی طرف روانہ کیا تھا وہ اس درجہ سمٹ سکڑ چکا ہے کہ شعراء کی جدید ترین نسل آگے بڑھ جانے کے بجائے مسلسل پیچھے ہٹ رہی ہے اور یقین و اعتماد کے خیابانوں میں قدم رکھنے سے پہلے ہی مایوسانہ پلٹ کر ذہنی عقدوں اور فکری سمتوں کے اُس خارستان میں اُلجھ کر رہ گئی ہے، جس نے ہماری شاعری کو گذشتہ دو تین صدیوں سے جکڑ رکھا تھا۔ فکر اور زاویۂ فکر دونوں بدل چکے ہیں، مگر تذبذب و تشکک نوجوانوں کے خیالات پر اس شدت سے طاری ہے کہ ان کے نزدیک ہر عمل کا انجام دھندلکا اور ہر حرکت کی انتہا افتاد ہے۔ ذاتی طور پر میں اس اُلجھاؤ کو ماحول کا اثر کہوں گا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ شاعر کی عظمت صرف اس بات میں نہیں کہ وہ اپنے گرد و پیش کی کما حقہٗ عکاسی کر لے، اور اپنے چار طرف بکھرے ہوئے نقوش کی ہو بہو تصویر کشی کر کے الگ ہو جائے۔ شاعر جس فن کی نمائندگی کرتا ہے، وہ تمام فنون لطیفہ بلکہ تقریباً تمام علوم انسانی میں بلند ترین درجہ رکھتا ہے، اس لئے صرف عکاسی اس فن کی نمائندگی کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ دراصل اپنے ماحول کا پورا پورا جائزہ لے لینے کے بعد ان دھندلکوں سے نکلنے کے لئے نئی نئی راہیں سجھانے اور ایک احسن اور اکمل انسانیت کی تعمیر ہی میں شاعر کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ وہ لوگ جو شعراء کو محض ماحول کی کسوٹی پر پرکھ کر اچھے بُرے کا اعلان کر دیتے ہیں، فن کی ترقی میں مزاحم ہو رہے ہیں، اور میری تمنا ہے کہ اُردو شاعری کے نقاد اب "عبوری" اور "سیلابی" اور "بحرانی" قسم کی اصطلاحات کی رٹ کو ختم کر کے اس سیلاب کا ایک رُخ اور ایک رستہ مقرر کریں، تاکہ ہمارا فن مسلسل افراتفری اور ابدی بے مقامی کے ہولناک نتائج سے محفوظ رہے۔

اوپر کی سطور میں میں نے جن جدید تر شعراء کی طرف اشارہ کیا ہے، اُنھوں نے ایک خاص جذبہ کو اپنے تمام افکار کا محور بنا لیا ہے اور اب تک صرف اُسی کے گرد گھوم رہے ہیں، اُنھیں شاید اس بات کا علم تک نہیں (اور اگر علم ہے تو اُس سے اغماض برتنے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔) کہ شدید احساس اور گہرا ادراک بڑی شاعری کے نمایاں ترین عناصر ہیں، جن اصحاب کو اس حقیقت کا علم ہے، انھوں نے صرف احساس یا صرف ادراک کو شاعری کا موضوع قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ احساس و ادراک کا متوازن امتزاج ہی آفاقی شاعری کا خالق ہے۔

صہبا لکھنوی خوش قسمتی سے اُن معدودے چند نوجوان شعراء میں سے ہیں جنھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی شاعری میں اس امر کا ثبوت پیش کیا ہے کہ وہ محسوس کرتے ہوئے سوچتے بھی ہیں اور سوچتے ہوئے محسوس بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ صہبا اپنی جماعت کے بیشتر افراد کی طرح اپنے ذہنی عقدوں کا شکار رہیں، لیکن ان کی اکثر نظموں میں (ادا بدایونی اور خیب الرحمٰن کی طرح) ان عقدوں کو کھولنے اور زندگی کا ایک واضح اور نمایاں نظریہ وضع کرنے کی تڑپ موجود ہے اور یہی خوبی اُن کے مستقبل کی درخشانی کی زبردست دلیل ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر صہبا اپنی فنی قوتوں کو ضبط و نظم سے استعمال کرتے رہے تو وہ بہت جلد نئے کارواں کے

---

[1] صہبا کی نظموں کا دوسرا مجموعہ۔

قافلہ سالاروں میں شمار ہونے لگیں گے۔

انسان کے بنیادی جذبات میں کبھی کسی دور میں تغیر رونما نہیں ہوا۔ ظاہری صورتوں نے چاہے جتنے بھی رنگ اختیار کئے ہوں لیکن یہاں بحث اُس جڑ سے ہے، جو آدمیت کے احساسات و تصورات کی گہرائیوں میں چلی گئی ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اشعار جو حسن و محبت سے متعلق ہوں۔ چاہے کتنے ہی پُرانے ہوں۔ ہمیں اب تک محبوب ہیں۔ اور آنیوالی نسلوں کو بدستور محبوب رہیں گے، کیونکہ محبت اور حُسن پرستی کا جذبہ کبھی مٹ نہیں سکتا ——— جذبات کے برعکس انسان کے حالات پیہم تغیر کی زد میں ہیں، یہ سمندر کی سطح پر بکھرا ہوا جھاگ ہے جو ہر نئی موج کے مس سے نئی صورت اختیار کر لیتا ہے، جو فنکار ان متغیر حالات اور بدلتے ہوئے ماحول کے گہرے مشاہدے سے عاری رہتا ہے، دیانتدار کہلانے کا مستحق نہیں۔

صہبانے اپنی اکثر نظموں میں ماحول کا نہایت صحیح اور مکمل جائزہ لیا ہے۔ اور اس جائزے میں اپنے احساسات کو سمو کر ان نظموں کو ایک یادگار صورت بخشی ہے۔ ہندستان کا شاعر جب اپنے ماحول کا جائزہ لیتا ہے تو ضروری بات ہے کہ مغربی استعمار کی انسان کشی سے متاثر ہو کر وہ موجودہ حالات کے انقلاب کے لئے پکاریگا اور اگر اُس کی قوتِ فکر احساس وادراک کے مرکب سے عبارت ہے تو انقلاب کی ایک صورت معین کر دیگا، ورنہ صرف مروّجہ طرزِ حکومت کو بدل ڈالنے کے لئے چیختا چلاتا رہے گا۔ اس طرح اگرچہ اُس کی دعوتِ انقلاب محض توڑ پھوڑ اور تخریب کا پیغام بنکر رہجائیگی (اور ہمارے اکثر ترقی پسند شعراء اس ٹریجیڈی کا شکار ہو چکے ہیں) لیکن یہ شور و شغب جدید تر شعراء میں سے کئی ایک کو سوچنے پر مجبور کر سکتا ہے اس لئے اُسے قطعی طور سے مردود قرار دینا عاقبت نا اندیشی ہے۔ صہبا نے اس کے متعلق سوچا ہے اگرچہ اُن کی دعوتِ انقلاب شروع شروع میں محض رواجی رہی۔ حوصلہ میں "ملت کے غداروں کی فطرت کا مزاج" (؟) دکھا کر وہ ہمیں کسی تعمیری پروگرام سے دوچار نہیں کرتے بلکہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ وہ "آج ہاتھوں کو خون سے رنگنے کے لئے اٹھے ہیں" ——— نظم کی ابتدا بھی خون ہے اور انتہا بھی خون، اور اس کے درمیان "پھونک ڈالوں گا"۔ "جھلس دوں گا" "برتھم برہم کروں گا"، "راکھ کر دونگا" کے نعرے ہیں ——— نظم پڑھنے کے بعد دنیا خاک اور خون میں لتھڑے ہوئے ایک بے ہنگم ملبے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتی ——— اسی طرح بھوک میں وہ زردار اور مفلس کے مسلسل تقابل کے بعد ہمیں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچاتے، لیکن چٹانیں اور اس قبیل کی دوسری نظموں میں صہبا ایک ایسے حساس انقلابی کی صورت میں جلوہ گر نظر آتے ہیں جس کے انداز فکر میں انفرادیت ہے اور جو اپنے ماحول کو عام زاویوں سے الگ ہو کر ایک ایسے گوشے سے دیکھ رہا ہے، جہاں خوردبینوں اور دوربینوں کی ضرورت نہیں پڑتی، جہاں ساری کائنات بیک وقت شاعر کے سامنے اپنی تمام وسعتوں اور پہنائیوں سمیت موجود رہتی ہے۔

صہبا سوچتے ہوئے شاعر ہیں اُن کی اکثر نظمیں اُن کے گہرے تفکر کی تصویریں ہیں، وہ بہت حساس ہیں اس لئے مسائل کو محض اچٹتی نظر سے نہیں دیکھتے، بلکہ تہوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ ڈوبنے کے بعد ابھرنا اور ابھارنا یا زیادہ صحیح الفاظ میں اُبھرنے کے راستہ کی طرف اشارہ کر دینا ہر اچھے شاعر کا خاصہ ہے اور صہبا نے بھی اس ضمن میں قابلِ تعریف کوششیں کی ہیں، لیکن بسا اوقات وہ تہوں کی روئیدگی میں اس قدر الجھ جاتے ہیں کہ اُن کا ذہن اور پڑھنے والے کے خیالات ایک ابدی بھڑبھڑاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں، وہ بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں اور بہت کچھ کہہ بھی لیتے ہیں، لیکن الجھ جاتے ہیں اگرچہ وہ اپنی فنی قوتوں سے اس الجھاؤ کو بھی حسین بنا لیتے ہیں، لیکن میں اُس وقت کا منتظر ہوں جب وہ ایک پختہ یقین اور بیتے ذہنی اعتماد کے ساتھ اشعار کہیں گے اور اپنی انفرادیت کو اُجالیں اور نکھاریں گے۔

ذہنی الجھاؤ مایوسی کا پیش خیمہ ہے، اسی لئے جب وہ زیر و بم میں کہتے ہیں ع: خواہشوں کی تربتیں ہیں زندگی کے موڑ پر۔

تو ہم سوچنے لگتے ہیں کہ اس موڑ سے آگے اور اس قبرستان سے پرے بھی تو بہت کچھ ہوگا - اور پھر زندگی کے ہر موڑ پر صرف تربتیں ہی تو نہیں ہوتیں ، اسی طرح تار و پود میں وہ سوچتے ہیں ع

کتنی بے نور ہے ، بے رنگ ہے ، بے آب ہے زلیست !

تو ہر ذہین قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیگا کہ زلیست منوّر اور بوقلموں بھی تو ہے . لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر کی ابدی مایوسی سے قطع نظر بعض اوقات انسان پر ایسی حالتیں بھی طاری ہو جاتی ہیں جب زلیست سچ مچ بے نور ، بے رنگ اور بے آب نظر آنے لگتی ہے اور ہماری طویل مسافت کا پہلا موڑ تربتوں سے پٹا ہوا دکھائی دیتا ہے -

باوجود ان مایوسانہ خیالات کے صہبا رجائیت کے سحر سے محروم نہیں اور کیا عجب ہے کہ ان کا احساس محرومی ہی حرکت و عمل کا پیغامبر ہو - ماحول میں وہ چونک کر پکار اٹھتے ہیں ؎

کروٹیں لینے کو بیتاب ہے دنیا کا نظام　　ہونیوالا ہے شکنجوں سے اب آزاد بشر

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شعاعِ امید ایک روز آفتابِ اقبال بن جائے - بہر کیف اس سے انکار نہیں کہ صہبا کا رجحان طلوع کی طرف ہے -

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ دورِ جدید میں حقیقت پسندی اور صداقت نگاری کی تحریک ایک عقدے (Complex) کی صورت اختیار کر گئی ہے - اس رجحان کی نمائندگی کرنے والا گروہ قدیم و جدید علم تنقید سے شناسا ہونے کے باوجود نہ جانے اس روشن تر حقیقت اور تابندہ تر صداقت سے کیوں منکر ہے کہ شاعری صرف عکاسی نہیں ، شاعری ایک تخلیقی عمل ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر تخلیق گذشتہ ان گنت تخلیقات کے عین من مشابہ ہو - شاعر حُسن کار ہے اور حُسن کار اپنے ماحول کے علاوہ اپنے تخیل سے بیگانہ نہیں رہ سکتا ، یہی وجہ ہے کہ جو شاعری گہرائی سے محروم ہے ، وہ ابدی نہیں محض ایک کوندا ہے جو لپکتا ہے تو آسمان و زمین چونک اٹھتے ہیں ، لیکن بجھتا ہے تو آسمان بھی اُسے بھول جاتا ہے اور زمین بھی ! -

میں ہمیشہ ہر اچھے شاعر کے کلام میں حسین حکمت اور جمیل گہرائی کا متلاشی رہا ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ صہبا اس بے بدل قوت سے محروم نہیں - بلکہ اُس کی ساری شاعری میں فلسفۂ زندگی کی ایک لہر سی دوڑتی چلی گئی ہے (یہاں یہ بحث مقصود نہیں کہ صہبا کا فلسفۂ زندگی کس نوعیت کا ہے ، ایک نوجوان شاعر سے ایک منضبط لائحۂ عمل کی توقع رکھنا زیادتی ہے) تعاقب میں وہ کہتے ہیں ع　　زندگی بھاگتے سایوں کا تعاقب ہی تو ہے !

کتنی بڑی سچائی کو کتنے مختصر الفاظ میں کتنی خوبصورتی سے سمو دیا ہے - لیکن صہبا اس حقیقت کے پاتال تک جاتے ہیں ع　　بھاگتے سائے ، مشیت جنھیں لوٹا نہ سکی

اس بیچارگی میں بھی حرکت و عمل کے تسلسل کا احساس کتنا ہمہ گیر اور حیات افروز ہے ! - اسی سچائی کو وہ ایک اور صورت میں یوں بیان کرتے ہیں ع　　زندگی کیا ہے ؟ حوادث کا حسین الجھاؤ

اور پھر جا بجا تنزے اور خاتمے تمام و کمال ـــــــ صہبا کا یہی کلام ہے جو اُس کے روشن مستقبل کی طرف ایک واضح اشارہ کر رہا ہے -

صہبا سیاست و فلسفہ کے موضوعات پر کہتے ہوئے یہ نہیں بھولتے کہ وہ شاعر ہیں اور شاعری فن کے جمالیاتی تقاضوں سے بیگانہ رہ کر شاعری نہیں کہلا سکتی - اوپر کے ایک مصرعہ میں " حوادث کا حسین الجھاؤ " کے الفاظ ہی صہبا کی اس خصوصیت کا ثبوت ہیں . لیکن صہبا نے چند ایسی نظمیں بھی کہی ہیں جن کا موضوع اوّل و آخر محبت ہے - ان نظموں میں اُن کا غنائی نظریہ اس درجہ صحت مندانہ ہے کہ کئی نوجوان شعراء کی اندھی جنس پرستی اور صہبا کے فطری عشق میں ایک واضح امتیازی خط کھینچا جا سکتا ہے - فرائڈ اور ایلیس کی آراء کو نقش کا الحجر سمجھنے والے حضرات کو یہ نہیں بھولنا چاہیے

کہ نفسیات و جنسیات کے سمندر کے یہ غواص بھی تو آخر انسان تھے اور ان کے نظریات میں ترمیم و تنسیخ کی وہ تمام گنجائشیں موجود ہیں جو سیاست دانوں اور ماہرین اقتصادیات کے معیّن و منضبط اصولوں میں پیدا کر لی گئی ہیں۔ اور جن سے مذہب کے الوہی احکام کو بھی خالی نہیں سمجھا گیا۔ صہبا نے صرف کتابوں میں عشق و محبت کے اسباب و علل کا ذکر پڑھ کر غنائی نظمیں نہیں کہیں۔ بلکہ اُن کے بیان کی بیساختگی، اظہار کی نرمی، اور جذبات کی صداقت سے صاف مترشح ہے کہ وہ آپ بیتی بیان کر رہے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ ہر انسان کا جنسی تجربہ یکساں ہو۔ الزام میرے اس دعوے کی دلیل ہے۔ صہبا کو محبت کی عظمت و طہارت کا احساس ہے وہ اسے محض شاعرانہ خیال آرائیوں کا ذریعہ نہیں بناتے ــــ بلکہ احساس میں کہتے ہیں ؎

تِرے خاموش تاروں کی پکاروں سے بھی واقف ہوں
تری بہکی جوانی کے نظاروں سے بھی واقف ہوں
مگر تجھ سے بطورِ نذر بھی دل لے نہیں سکتا
تجھے دیکر بھی سب کچھ اک محبت دے نہیں سکتا

اور اس مجبوری کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ محبت کے متعلق اپنا نظریہ بیان کرتے ہیں ؎

محبت جذبۂ بے اختیاری ہے، پرستش ہے،

بے اختیارانہ پرستش کی کیفیتوں کی تفصیل میں جانا اس مصرع کی جامعیت پر ظلم کرنا ہے۔

صہبا نے ذہن انسانی کا خاصا مشاہدہ کیا ہے، اوپر اس کی کئی مثالیں درج کیجا چکی ہیں۔ لیکن جب صہبا خارجی مشاہدے کو داخلی گہرائیوں کا نمائندہ بنا کر پیش کرتے ہیں تو اُن کی قوت مشاہدہ کی ہمہ گیری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ؎

اونچے اونچے پیڑ صحرا میں، قطار اندر قطار
دور تک جیسے کھڑے ہوں خامشی کے پہرہ دار　　　زیر و بم

اور ؎

سبزۂ گیتی کی یہ مستی بھری انگڑائیاں
لہلہاتے کھیت، کھیتوں کی حسیں پہنائیاں　　　زیر و بم

نیز ؎

صبح کی چھاؤں، سرد انگارے
مضمحل چاند، مضمحل تارے
راہرو جیسے ہوں تھکے ہارے　　　جنّتِ موہوم

"مضمحل چاند، مضمحل تارے!" ــــــــــــــــ ان چند الفاظ میں آسمان کی لٹتی ہوئی بساط کی مکمل تصویر موجود ہے۔

لکھنوی ہونے کی رعایت سے صہبا کو زبان کے معاملہ میں حد درجہ محتاط ہونا چاہئے تھا، لیکن وہ زبان کے اصولوں کا احترام کرنے کے باوجود کئی مقامات پر ان سے انحراف کر جاتے ہیں، مگر یہ انحراف ایک بڑی حد تک اجتہاد کے قریب پہنچ جاتا ہے، زبان میں ترقی کے امکانات سے صہبا آگاہ معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں الفاظ کے انتخاب پر بھی اچھی قدرت حاصل ہے اور وہ صرف قافیہ و ردیف کو ترنم کا ذریعہ نہیں قرار دیتے، بلکہ الفاظ کی ایک امنڈتی ہوئی لہر سے سارے مصرع میں موسیقی کی روح کو حل کر دینے کے قائل ہیں۔ کئی جگہ تو اُن کے قلم سے ایسے اشعار نکل گئے ہیں کہ اُنکی صحیح لذت سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے کسی موسیقار کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ اشعار خود بخود ایک مترنم لرزش بنکر

ہمارے حساسات میں تیر جاتے ہیں ؎

تو نے چاہا تھا مرے ساتھ چلے، ساتھ چلے
حوصلے راہ میں تھک جائیں گے معلوم نہ تھا
دیکھ کر زیست کی گرتی ہوئی دیواروں کو
زلزلے آئیں گے اور آئیں گے، معلوم نہ تھا　　　زلزلے

اور ؏

اک خلش موہوم سی، ایک ٹیس نامعلوم سی　　　زیر و بم

اور ؎ کوئی احساس تمگ و تاز نہیں، کچھ بھی نہیں　　　کوئی آہٹ، کوئی آواز نہیں، کچھ بھی نہیں　　　آہٹ
نیز ؎ کتنی بے نور ہے، بے رنگ ہے، بے آب ہے زیست　　　کتنی افسردہ ہے، پژمردہ ہے، بے خواب ہے زیست　　　تار و پود
اور ؎ کتنے شعلے ابھی بھڑکے نہیں، بھڑکے ہی نہیں　　　کتنے طوفان ابھی مچلے نہیں، مچلے ہی نہیں　　　تار و پود

صہبا، کا کلام اس قسم کے مترنم اشعار سے لبریز ہے، لیکن صہبا اپنی اچھی خاصی نمایاں انفرادیت کی پرواکئے بغیر کبھی کبھی مقبول شعراء کی تقلید پر اتر آتے ہیں اور (غیر شعوری طور پر ہی سہی) کئی ایسے الفاظ اور بندشیں نظم کر جاتے ہیں کہ بجائے اُن کے، ہمارے ذہن پر کسی دوسرے شاعر کا اثر نمایاں ہونے لگتا ہے۔ تعاقب میں وہ فیض احمد فیض سے متاثر ہیں اجنبی راہیں میں یوسف ظفر سے اور تم نے تو کہا تھا آؤں گی میں اختر شیرانی سے، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ یہاں نقالی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ صہبا، کی شاعرانہ قوتیں اتنی محدود نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ وہ کئی شعراء سے وقتی طور پر اس قدر متاثر ہو گئے ہیں کہ اپنی ذات کو پس منظر میں رکھنا گوارا کر لیا ہے، ویسے اپنے معاصرین سے ایک حد تک متاثر ہونا گناہ نہیں۔ در میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ اگر اردو شاعری میں اکبر الٰہ آبادی اور حالی کا وجود نہ ہوتا، تو اقبال کا رنگِ سخن کچھ اور ہوتا اور ڈاکٹر اقبال نہ ہوتے تو جوش اب تک "صنم دشمن ایمان" کو پہلو میں مچلتا دیکھتے رہتے اور اگر جوش ہماری سیاسی اور معاشرتی زندگی کے تالاب میں لہروں پر لہریں نہ پیدا کرتے تو ترقی پسندی کی تحریک چند نوجوانوں کے ذہنوں میں گھٹ کر دم توڑ دیتی۔

صہبا، کا تاریخی اور جدلیاتی مطالعہ نظریاتی زیادہ ہے اور فکری کم، لیکن ایک نئے اور نوجوان شاعر کی حیثیت سے وہ کامیاب ہیں۔ وہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہیں جہاں وہ مجبوری، شکر ہے اور وہ ایسی معمولی نظمیں کہتے ہیں، شعلہ اور جواب میں پرانے خیالات کو پرانے انداز میں دہراتے ہیں۔ تاج کی خوبصورت ابتدا کرنے کے بعد آخر میں جا کر ساری نظم کو دھندلا دیتے ہیں، وہیں وہ تار و پود، اوٹ، جائزہ اور مرحلہ وغیرہ ایسی مکمل اور مؤثر کامیاب نظمیں کہ سکنے پر بھی قادر ہیں۔ ساتھ ہی ان کو اپنی کمزوریوں کا احساس ہے اور ان کا جواز بھی اُن کے ہاں موجود ہے۔ کتاب پڑھنے کے بعد ہم صہبا، کے اعترافات کو سراہتے ہیں، لیکن کاش ان اعترافات اور اس جواز کی بنیاد الجھنوں کی بجائے اعتماد و یقین پر ہوتی۔

نظم میں نئی نئی فارموں کے کامیاب تجربے کرنے کے علاوہ صہبا آزاد نظم بھی کہتے ہیں۔ گردوپیش آزاد شاعروں کی کئی نظموں سے اس لحاظ سے بلند ہے کہ ردیف و قافیہ سے نظم کو محروم کر کے انھوں نے وزن کے انتخاب میں نہایت خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے اور مختصر و طویل مصرعوں کی رگوں میں موسیقی کی روح حلول کر ڈالی ہے۔

صہبا غزل سے باغی نہیں، یہ اُن کی سلامت روی کی ایک مثال ہے اور وہ اس حسین و جمیل صنف شاعری میں ایک نئی روح پھونکنے کے قائل ہیں، اس مجموعہ میں اُن کی شاید کل تین غزلیں شامل ہیں۔ لیکن یہ چند اشعار پڑھئے، نوجوان شعراء میں عمق نظر اور پختگی بیان کی ایسی بہت کم مثالیں مل سکیں گی اور پھر غزل تو انتہا درجہ کا تجربہ اور مسلسل مشق

یعنی فنی ریاضت چاہتی ہے ؎

نہ جینا ہی آساں نہ مرنا ہی آساں
عجب تیری دنیا کا عالم ہے یا رب

؎ موت کیا ہے ایک خونیں قہقہہ
زیست کے رنگیں گلستانوں سے کھیل

پہلا مصرع موت کے متعلق طول طویل نظموں پر بھاری ہے۔ ایک اور غزل کا ایک شعر ہے ؎

پھونک دے پھونک دے بنائے قفس　　آشیاں حد آشیاں تک ہے

میرے خیال میں لمبی چوڑی گرجتی دھاڑتی انقلابی نظموں سے وہ کام نہیں ہو سکتا جو صہبا کی غزل کے اس تنہا شعر کے بس میں ہے۔

صہبا، ایک ہونہار فن کار ہیں اور اگر انھوں نے خیالات و احساسات پر نظم و ضبط رکھنے کے علاوہ، فوری طور پر متاثر ہو جانے سے بچ کر زندگی کی وسیع تر پہنائیوں پر منڈلانے کے بجائے اُن میں ڈوب جانے کے رجحان کو قائم رکھا تو وہ آئندہ دور میں اردو کے ایک منفرد شاعر تسلیم کئے جائیں گے۔ مجھے اُن کی قوتوں پر اعتماد اور اُن کی صلاحیتوں پر یقین ہے۔ اللہ تعالیٰ برکت اور استقامت دے۔

(بقیہ غزل کا ماضی، حال، مستقبل)

سنہ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ اردو میں آزاد نظم اور نظم معرا کا رواج ہوا۔ ان نئے اسلوبوں کے علم برداروں نے اپنے ابتدائی جوش میں ردیف و قافیہ اور وزن و بحر کو ایک غلط چیز قرار دیا، اور یہ دعویٰ کیا کہ بے قافیہ اور آزاد شاعری ہی نظم کا صحیح و معقول اسلوب ہے۔ اب ان کا نقطۂ نظر زیادہ معتدل اور روادارانہ ہے، مگر اُس وقت جو اعتراضات پابند شاعری پر کئے گئے غزل بھی اُن کا موضوع بنی۔ اب وہ اعتراضات اپنا وزن کھو چکے ہیں، اور خود آزاد شاعری اپنی زندگی اور بقا کے لئے جد و جہد میں مصروف ہے۔

اسی زمانے میں یہ مسئلہ بھی ترقی پسند نقادوں کے زیر غور رہا کہ آیا غزل ترقی پسند شاعری کی ایک صنف کی حیثیت سے زندہ رہ سکتی ہے یا نہیں۔ بعض نقادوں کا خیال تھا کہ غزل اپنی بنیادی سرشت کے لحاظ سے ایک ایسی صنف ہے جو فراری، رومانی اور انفرادی جذبات ہی کی ترجمان بن سکتی ہے اور جدید ترقی پسندانہ خیالات اور رجحانات کی کسی طرح متحمل نہیں ہو سکتی۔ بعضوں کی رائے اس کے برعکس تھی۔ اب غالباً یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ غزل نظم کی دوسری اصناف کے دوش بدوش سماجی زندگی کے ٹھوس حقائق اور جدید ترقی پسندانہ، انقلابی اور عوامی رجحانات کی حامل بن سکتی ہے، اور اس میں نئے ذہنی مطالبات سے ہم آہنگ ہونے کی پوری صلاحیت ہے۔ یہ تصور غزل کے جس خوش آئند مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے اس کی جھلک بعض ترقی پسند غزل نگاروں کے کلام میں نظر آ سکتی ہے۔

یہ ہے ایک نہایت سرسری خاکہ غزل کے نشیب و فراز، بلندی و پستی اور مقبولیت و نامقبولیت کا۔ اور یوں موافق و ناموافق حالات کے درمیان غزل کا کارواں منزل بہ منزل بڑھتا چلا گیا ہے۔ اس کی آخری منزل کہاں ہے، یہ کون کہہ سکتا ہے؟۔

ماہرِ فن

یاد نہ کر دلِ حزیں.........

آدم خور

عمل اور ردِّ عمل

تاریکیاں

آبشار

ہر حقیقت ایک خاموش افسانہ ہے اور ہر افسانہ ایک بے حجاب حقیقت!

یہ فنکار

کرشن چندر واقعی "ماہرِ فن" ہے۔ افسانے لکھتے لکھتے ریڈیو میں جا پہنچا۔ فضا راس نہیں آئی، پردۂ سیمیں کی کشش "فلمستان" میں لے آئی۔ افسانہ نگار سے فلمکار بن گیا۔ "سرائے کے باہر" فلمایا، جو بعض جگہ اپنی ترقی پسندی کے باعث پکچر ہاؤس سے باہر ہی رہا۔ اب "راکھ" سے چنگاریاں اڑا رہا ہے اور "خاک و خاکستر" سے ایک "جہانِ تازہ" کی تخلیق میں منہمک ہے ـــــ غریبوں اور کسانوں سے ہمدردی کرتا ہے اور خود امیرانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا یہ تضاد عام ہے۔ حُسن کا پرستار ہے۔ اس کے طنزیہ افسانے ترقی پسند ادب کی جان ہیں۔ "ماہرِ فن" مغربی دانشوروں پر ایک شگفتہ طنز ہے۔

خواجہ احمد عباس جتنے چھوٹے قد کا ہے اتنا ہی اونچا ترقی پسند صحافی ہے "جہانیاں جہاں گشت" ہے سادلانڈ میں جذب ہو کر ابھر آیا ہے، زیادہ تر انگریزی میں لکھتا ہے۔ نفسیاتِ انسانی کا ماہر ہے، اس برِ عظیم کے خونی سیلاب پر "یاد نہ کر دلِ حزیں" لکھ کر اس نے افسانہ کی اچھوتی تکنک کے اظہار سے بہت اونچا مقام حاصل کر لیا ہے۔ آجکل "زعفران کے پھول" کی سرزمین کے لئے اپنی نگارشات وقف کر رکھی ہیں۔

ابراہیم جلیس "تکونے دیس" کا سلونا باسی لاابالی اور تلوّن کیش "جلیسوف" شہر میں گھوم پھر کر اپنے مرکز پر آگیا ہے زیادہ تر "فضول سی الجھنوں" میں مبتلا رہتا ہے۔ اِن دنوں تازہ ناول "کارنوالس اسٹریٹ" لکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید یہ بھی "چور بازار" کی طرح مختصر افسانہ بن جائے، اس لئے کہ یہ "نقب زن" ـــــ نشتر زن ـــــ (جلیس کے لوگوں نے کئی پیار کے نام رکھ چھوڑے ہیں) "طویل قسم کا انسان" ہونے کے باوجود "مختصرات" میں زیادہ کامیاب ہے۔ شوخی، بیباکی اور بلیغ طنز اس کے افسانوں کی رعنائی ہے "آدم خور" ـــــ اب کے ایک "عام فہم" کہانی سنا رہا ہے!۔

صدیقہ بیگم سی پی میں موتی بنکر چمکی، اپنی راہ خود بنائی اور اب اس کا فن نکھرتا جا رہا ہے، گوندیا سے "نورس" نکالا۔ حالات سازگار نہ رہے۔ اب گنگا جمنا کے سنگم پر آشیانہ بنایا ہے۔ "عمل اور ردِ عمل" ـــــ "تتلیاں یونہی ہاتھ نہیں آجایا کرتیں اور ـــــ"

انور عظیم بیتابِ فطرت اشتراکی افسانہ نگار، کارخانوں کے دھوئیں کا عکس، گیا کے تقدس میں ڈوبا ہوا انور تیزی سے ابھر رہا ہے۔ "چسکر لاتے ہوئے" پڑھ کر لوگ چکرا گئے، چونک پڑے ـــــ اب تاریکی میں روشنی دکھانے کی کوشش کی ہے۔ "تاریکیاں" "تازہ بہار کی جھلک ہے۔

رُشدی

کرشن چندر

ماہر فن

(مغربی دانشوروں کے نام)

جب ہندوستان میں انگریزوں کا راج تھا، ان دنوں مغرب سے بڑے بڑے ماہر فن بلائے گئے، چونکہ ہندوستان کاشتکاروں کا ملک ہے۔ اس لئے سب سے پہلے یہاں کھیتی باڑی کا ماہر فن آئے، انھوں نے ہل چلانے کے نئے طریقے ایجاد کئے۔ گو ہل وہی پرانے رکھے لیکن کھاد بنانے اور اسے کھیتوں میں ڈالنے کی ایسی نئی ترکیبیں نکالیں، کہ ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں فصل مغلیہ سلطنت کے وقت سے آدھی رہ گئی، اس کے بعد انھوں نے اپنی توجہ حکومت کے نظام کی طرف منعطف کی، کیونکہ ہندوستان میں تراج کا عالم تھا ہر گاؤں میں اپنی پنچایت تھی اور حکومت اور انصاف کا کہیں مرکز نہ تھا پنچایتوں میں من مانی کارروائیاں ہوتی تھیں، اور انصاف کے پردے میں ظلم روا رکھا جاتا تھا، ایک ماہر فن نے جس کا نام میکالے تھا۔ اس سلسلے کو بیک جنبش قلم دور کیا اور پنچایت انصاف کو مٹا کے اک ایسے سلسلۂ قوانین کی داغ بیل ڈالی، کہ جس کی رُو سے دنیا کا ہر کام جرم بن گیا یعنی آپ کوئی کام کیجئے یا نہ کیجئے، آپ ہر وقت اس نئے سلسلے کی تعزیر کی زد میں رہتے ہیں، اس سلسلۂ قوانین کی شرح کے لئے وکلاء مقرر کئے گئے جنھوں نے اس نئے قانون کی تشریحات و توضیحات کے سلسلے میں اتنی مبسوط و مفصل کتابیں لکھیں کہ اگر ان کتابوں کو جلایا جائے تو اس سے اتنی بھاپ پیدا ہو سکتی ہے کہ ایک بحری جہاز دنیا کے گرد پچاس بار چکر لگا سکتا ہے یا اگر ان کتابوں کے حروف کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کے جوڑا جائے۔ تو زمین اور چاند کے درمیان اک نئی سڑک تیار ہو سکتی ہے۔ ان کتابوں کا مجموعی حجم اتنا بڑا ہے کہ اس سے بحیرۂ اطلانٹک میں دو ہزار مربع میل کا ایک نیا جزیرہ تیار ہو سکتا ہے جس میں دو کروڑ چینی یا دو لاکھ ہندوستانی یا دو سو انگریز باآسانی بود و باش کر سکتے ہیں۔! ایک ماہر فن کی عظمت کا اندازہ اس سے بڑھ کے اور کیا ہو سکتا ہے ؟

انصاف کے طور طریقے بدلنے کے بعد ایک دوسرے ماہر فن نے مالگزاری کے سسٹم کی طرف توجہ فرمائی، اس سے پہلے لگان کا طریقہ بالکل سیدھا سادہ تھا یعنی کسان اپنی زمینوں کے مالک تھے اور راجہ کو ہر فصل کے موقع پر اپنی فصل کا ایک حصہ بطور لگان عطا کرتے تھے۔ اگر فصل کم ہوتی تھی تو یہ حصہ کم ہو جاتا۔ فصل زیادہ ہوتی تو راجہ کو بھی لگان زیادہ ملتا۔ ماہر فن نے اس جاہلانہ طریقے کو بھی خیرباد کیا۔ اور ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا جس سے کسان نہ اپنی زمینوں کے مالک رہے۔ نہ اپنی فصل پر اُن کا کوئی اختیار رہا۔ اور یہ سب کچھ مالگزاری کے بندوبست کے تحت ہوا، اور اس خوبی سے ہوا، کہ پٹواری، نمبردار، اہلکار، اور زمیندار اور سرکار کو فصل کے حصے بخرے دینے کے بعد کسان کے پاس دو روز کا کھانا بھی نہ بچتا تھا۔ اس حسین طریقۂ مالگزاری سے تھوڑے ہی عرصے میں ہندوستان کے کسان دنیا کے امیر ترین کسانوں میں شمار ہونے لگے۔

اگلے زمانے میں سکوں کا رواج زیادہ نہ تھا چیزیں کوڑیوں کے مول بکتی تھیں، اور با افراط ملتی تھیں۔ ہر ہندوستانی کو اس کی بنیادی ضروریات کے لئے ایک گھر، کپڑا، کھانا، بیوی اور موت نجاتی تھی۔ لیکن ایک ماہر فن نے اس میں بھی اک نئی طرح ایجاد کی، اور کاغذ کا سکہ چلایا، جوں جوں یہ سکہ چلتا گیا۔ لوگوں کے پاس دولت بڑھتی گئی۔ جوں جوں دولت بڑھتی گئی۔ بنیادی ضروریات گھٹتی گئیں، حتیٰ کہ ڈیڑھ سو سال کے بعد ایک اوسط ہندوستانی کے سر پر نہ چھت رہی۔ نہ بدن پر کپڑا رہا، نہ پیٹ میں روٹی رہی۔ روپیہ بینکوں میں لاکھوں، کروڑوں، بلکہ اربوں جمع تھا، لیکن بازار میں ڈیڑھ پاؤ گیہوں یا دو گز کپڑا دستیاب نہ ہو سکتا تھا۔ بیویاں صرف بلیک مارکیٹ میں دستیاب ہوتی تھیں۔ اور موت کے لئے کفن بھی ڈھونڈھے سے نہ ملتا تھا۔ ہندوستان میں کاغذ کے سکے کے آنے سے پہلے سونے کا

سکہ رائج تھا پھر چاندی کا سکہ رائج ہوا پھر آدھی چاندی اور آدھے نکل کا سکہ۔ اور آخر میں تانبے کا سکہ بھی باقی نہ رہا، کاغذ ہی کاغذ ہے ایک روز کاغذ بھی نہ رہیں گے اور صرف اللہ کا نام باقی رہ جائیگا۔ کہ اللہ سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی بینکر نہیں!

ہندوستانی بڑے جنگلی، وحشی، بربری قوم تھے، ہر گاؤں میں ایک مکتب تھا، جہاں یہ لوگ ایشیا کی نیٹو وحشی زبانیں سیکھتے تھے چنانچہ اُس زمانے میں ہر گاؤں میں سنسکرت، عربی اور فارسی کی تعلیم دیجاتی تھی، اور نوٹنکی، اور راس لیلا کے بیہودہ تماشے ہوا کرتے تھے اور عورتیں چکی پیستے وقت اپنے من گھڑت ماما رو لوک گیت گاتی تھیں یہ تھا اس زمانے کا تمدن کلچر، ماہرِ فن جہاں ریل گاڑی، ڈاک، اور سڑکیں لائے، وہاں انھوں نے تعلیم اور کلچر کا یہ سارا ڈھرا ہی بدل دیا، میکالے نے مکتب کی تعلیم بند کر دی۔ اور اس طرح سے گاؤں کے لوگ اس جاہلانہ ایشیائی تعلیم سے چھوٹ گئے۔ ادھر انگریزی تعلیم کا سلسلہ جاری کر دیا گیا جو صرف شہروں تک ہی محدود رہا۔ اس لئے تھوڑے ہی دنوں میں خواندہ ہندوستان ناخواندہ ہندوستان ہو گیا۔ اور جہاں پہلے پچاس ساٹھ فیصدی لوگ اپنی زبان پڑھ لکھ لیتے تھے وہاں اب صرف پانچ، سات فیصدی پڑھے لکھے رہ گئے اور وہ بھی انگریزی میں ایسی گٹ پٹ کرتے تھے جو بیشتر ہندوستانیوں کے پلے نہ پڑ سکتی تھی اس صورت حال پر اک تازیانہ جان گل کرائسٹ نے لگایا۔ یہ بڑا مشہور ماہرِ فن تھا۔ اور اس نے سنسکرت اور فارسی ملا کے اُردو اور ہندی دو نئی زبانیں ایجاد کیں۔ اور اس طرح سے ہندوستان میں اک نئے لسانی کلچر کا درخشندہ باب کھولا۔ سکیس لومر نے وید دریافت کئے، اور انگریزی انجینئروں نے مغلیہ حماموں کی محیر العقول صنعت کی ریسرچ کی، اور محکمۂ آثار قدیمہ قائم کیا۔ اس سے پہلے ہندوستان میں کوئی محکمۂ آثار قدیمہ نہ تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے لوگ خود نت نئی عمارتیں بناتے تھے۔ اور فن تعمیر میں جدتیں روا رکھتے تھے۔ اب نئی عمارتیں بننی بند ہو گئیں۔ اور حاکموں نے پرانی عمارتوں کی دیکھ بھال کے لئے محکمۂ آثار قدیمہ کھول دیا۔ یہ بھی ایک ماہرِ فن کا اعجاز ہے۔!

ماہرینِ فن نے ہندوستان کا نقشہ بدل ڈالا۔ اس کی تاریخ بدل دی، اسے نئی زندگی عطا کی، اور اس زندگی کو قائم رکھنے کے لئے اک نئے طب کو ایجاد کیا۔ ان ماہرینِ فن کے آنے سے پہلے ہندوستان میں صرف آٹھ دس امراض ہوتے تھے، بخار، دمہ، بواسیر، کوڑھ، پیچش، مرگی، ہذیان، جنون اور اس قسم کی دو چار اور الا بلا بیماریاں، اور بس اپنی طبابت یہاں پر ختم ہو جاتی تھی اور ان امراض کے علاج کے طریقے بھی گنے چنے تھے۔ ماہرینِ فن نے ان سب کو یک قلم موقوف کیا، وہ لوگ نئی دوائیں ساتھ لائے۔ اور ساتھ ہی میں نئی بیماریاں بھی، مثلاً ہیضہ، پلیگ، آتشک، جتنی جائیں کہ ان بیماریوں کا وجود ان ماہرینِ فن کے آنے سے پہلے اس ملک میں ثابت نہیں ہوتا۔ اور اب تو بیماریوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی ہے کہ بیمار کم ہیں اور بیماریاں زیادہ اور بسا اوقات آدمی مر جاتا ہے اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اسے کونسی بیماری لاحق ہوئی تھی؟

گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں ماہرینِ فن نے ہندوستانی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں چھوڑا، جس کے چولے انھوں نے درست نہ کئے ہوں، اور اپنی دانست میں ٹھیک ٹھاک کر کے اُسے کام کا نہ بنا دیا ہو۔ اس سے ہندوستانیوں کو جو فائدہ ہوا وہ تو ظاہر ہی ہے۔ لیکن دوسرے ماہرینِ فن کے لئے بڑی مصیبت ہو گئی ہے۔ ادب، تاریخ، سیاست، کلچر، تعلیم، قانون، رواج، ہندوستانی زندگی کا کوئی ایسا کونا کھدرا نہیں۔ جہاں گذشتہ ماہرینِ فن کی لوح ثبت نہ ہو۔ اب نئے آنے والے ماہرِ فن کیا کریں، اور کس طرف اپنی توجہ مبذول کریں۔ یہ سوال بڑا ٹیڑھا ہے اور کئی ایک ماہرینِ فن کو پریشانی میں ڈالے ہوئے ہے۔

مثال کے طور پر مجھے گذشتہ دنوں نئی دلی میں ایک فرانسیسی ماہرِ فن سے متعارف ہونیکا شرف حاصل ہوا۔ آپ گذشتہ پچیس سال سے اس ملک میں مقیم ہیں، اور ہندوستانی ساڑھی کے بارے میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ جب میں نے ان سے اس کے بارے میں سنا تو بہت حیران ہوا۔

"ہندوستانی ساڑھی۔ مگر اس میں ریسرچ کی کونسی بات ہے؟ میرا مطلب ساڑھی سے ہے اُسے پہننے والی عورت سے نہیں،

ظاہر ہے کہ اس میں ریسرچ کی بہت گنجائش ہے!"

"ارے صاحب یہی تو بات ہے کہ آپ ہندوستانی ہو کر بھی اپنے ملک کی بابت کچھ نہیں جانتے۔ مثال کے طور پر کیا آپ جانتے ہیں کہ شیروانی، اچکن، پاجامہ، بلاؤز، کوٹ، پٹی کوٹ، انڈرویر، جراب، موزہ، بنیان، گلوبند ہر ایک شئے کے متعلق ماہرین فن ریسرچ کر چکے ہیں۔ لیکن ساڑھی — اس حسین لباس کے متعلق کسی کو ریسرچ کرنے کا خیال بھی پیدا نہ ہوا۔ اور یہ کام مجھی کو سوجھا موسیو شیفر کو — ایک فرانسیسی کو۔" اتنا کہہ کر فرانسیسی ماہر فن اک مرغ کی طرح چھاتی پھلانے لگے۔ اتنے میں انھیں کھانسی نے آگھیرا، اور آپ کھانستے کھانستے اکڑوں ہو گئے۔

"مگر موسیو شیفر، اس میں ریسرچ کی بات ہی کیا ہے۔ ساڑھی ایک سیدھا سادھا ہندوستانی لباس ہے۔ جسے ہندوستان کی عورتیں کئی طریق سے پہنتی ہیں۔ پنجابی عورتیں جو ساڑھی کو شلوار کی طرح استعمال کرتی ہیں۔ یوپی کی عورتیں جو ساڑھی کو لہنگے کی طرح استعمال کرتی ہیں مرہٹی عورتیں کہ ساڑھی کا لنگوٹ بناتی ہیں، گجراتی عورتیں کہ ساڑھی سے کوا پرٹو بینک کا کام لیتی ہیں۔ بس یہی دو چار باتیں ہیں ساڑھی میں اور اسمیں دھرا کیا ہے۔"

"ہاں! یہ تو مجھے معلوم ہے۔ مگر پچیس سال کے عرصے میں جو بات میں اب تک معلوم نہیں کر سکا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ہندوستانی عورتیں اس ساڑھی کو پہنتی کیسے ہیں؟ دیکھئے میں ایک شریف فرانسیسی ہوں کسی شریف ہندوستانی خاتون سے کیسے پوچھ سکتا ہوں؟ ہم فرانسیسی لوگ دنیا کی متمدن ترین قوم ہیں۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔

موسیو شیفر کہہ رہے تھے۔ "لوگ کہتے ہیں کہ ساڑھی ایک لباس ہے۔ مجھے تو چھ لباس معلوم ہوتے ہیں۔ پیچھے سے کچھ اور ہے — سامنے سے کچھ اور ہے۔ کولھوں کے پاس کچھ اور ہے۔ ٹخنوں کے پاس کچھ اور ہے۔ اور پھر سامنے چھاتی پر اک لکیر کی طرح سکڑ جاتا ہے اور شانے سے گذر کر اک آبشار کی طرح نیچے گرتا ہے۔ خدارا ہمیں بتاؤ کہ لباس کیا ہے۔ کتنے ٹکڑوں میں بٹتا ہے۔ اور اسے کس طرح پہنا جاتا ہے؟ میں تو یہی سوچ سوچ کر بوڑھا ہو گیا۔"

میں نے کہا۔ "دراصل، اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اب آپ پوچھتے ہیں تو بتانا ہی پڑے گا۔ ایک پردیسی ماہر فن کی مدد کرنا ہر ہندوستانی کا دھرم ہے۔ تو سنئے۔ شروع میں عورتیں جب چرخہ کاتی تھیں تو سوت اپنے گرد یوں لپیٹی جاتی تھیں کہ دو ماہ میں پندار گرد اک ساڑھی بن لیتی تھیں۔ لیکن یہ طریقہ اب بہت پرانا ہو گیا ہے اور ہندوستان کے زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہے۔"

فرانسیسی ماہر فن نے شیفر کا قلم نکال لیا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ میری باتوں کو اپنی نوٹ بک میں درج کر رہا تھا۔

"اس کے بعد وہ زمانہ آیا" میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جب ساڑھی جسم پر نہیں لکڑی پر بنی جاتی تھی۔ جب ساڑھی تیار ہو جاتی۔ تو اسے اک مٹی کے بت کے گرد باندھ دیا جاتا۔ اور پھر جب ساڑھی اس کے گرد بندھ جاتی۔ تو مٹی کا بت جو نیچ میں سے کھوکھلا ہوتا تھا۔ توڑ دیا جاتا اور عورت پاؤں کی طرف سے اس کھوکھلی ساڑھی میں داخل ہوتی اور اسے پہن لیتی یہ طریقہ بہت دیر تک رائج رہا، لیکن اس میں دو قباحتیں تھیں۔ ایک تو ہر بار ساڑھی پہننے کے لئے مٹی کا بت تیار کرنا پڑتا تھا دوسرے پاؤں کے راستے ساڑھی میں داخل ہونے سے اس میں کئی جھول پڑ جاتے تھے جس سے ساڑھی کی خوبصورتی میں فرق پڑتا تھا۔ اس لئے یہ طریقہ بھی زیادہ دیر تک مقبول نہ رہ سکا۔"

"پھر!"

"پھر موجودہ طریقہ رائج ہوا جب ساڑھیاں ملوں میں مشینوں کے ذریعہ تیار کی جانے لگیں۔ دراصل مسٹر شیفر موجودہ ہندوستانی ساڑھی ایک لباس نہیں ہے۔ اس کے چھ ٹکڑے ہیں، ایک ٹکڑا کولھوں کے گرد تیار کیا جاتا ہے۔ دوسرا ٹکڑا اس کے

نیچے، رانوں سے پنڈلیوں تک۔ تیسرا ٹکڑا پنڈلیوں سے ٹخنوں تک پھیلا ہوتا ہے، چوتھا ٹکڑا ناف سے شانے تک، پانچواں شانے کے پیچھے، ـــــ"

"اور چھٹا؟"

"چھٹا ٹکڑا کبھی سر پر ہوتا تھا۔ مگر آجکل نظر نہیں آتا۔"

"خوب! تو گویا یہ ایک ساڑھی چھ ٹکڑوں کا لباس ہے۔ مگر صاحب میں نے تو بازار میں کئی ساڑھیوں کو دیکھا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ہر ایک ساڑھی کو دیکھا ہے، مگر یہ تو ایک ہی ٹکڑا ہوتا ہے۔"

"ہاں، ہاں ہوتا ہے ایک ہی ٹکڑا۔ مگر صرف خریدتے وقت، خریدنے کے بعد اس کے چھ ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ عورتیں انھیں اپنے ہاں کاٹ کر الگ الگ فٹ کر لیتی ہیں۔ اور ان ٹکڑوں کو پہن لیتی ہیں۔ اور اس کے بعد اپنے جسم پر سنگر مشین چلا کر پھر ان ٹکڑوں کو جوڑ لیتی ہیں، اس طرح کہ اگر کوئی عورت اپنی ساڑھی اتارے تو وہ پھر ایک ہی ٹکڑا معلوم ہو گی۔"

آپ نے کبھی کسی عورت کو ساڑھی اتارتے دیکھا ہے؟"

"جی نہیں" فرانسیسی کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا "ایسا اتفاق تو کبھی نہیں ہوا۔"

"خیر جانے دیجئے۔ اس کے لئے دوسرے ماہرِ فن کی ضرورت ہے۔"

ـــــ ۲ ـــــ

میں نے سمجھا تھا۔ چلو اس ماہرِ فن سے جان چھوٹی، مگر اس کے تیسرے یا چوتھے روز وہ مجھے پھر کناٹ پلیس میں گھومتا ہوا مل گیا۔ بڑا اداس، اداس سا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کہا "ہلو۔ پروفیسر شیفر!"

مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر شگفتگی کے آثار نمودار ہوئے۔ بڑے تپاک سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں جلد فرانس لوٹ جاؤں گا۔ مگر ایک مسئلہ اور بڑا ٹیڑھا آن پڑا ہے، حل ہی نہیں ہوتا، اگر آپ اس میں میری تھوڑی سی مدد کریں۔"

"ضرور، ضرور فرمایئے۔"

"میں قطب مینار کے بارے میں غور کر رہا تھا، اب آپ دیکھئے نا۔ اتنی بڑی عمارت، اتنے بوجھل پتھر اتنی اونچائی تک کیسے لے جائے گئے؟ جس زمانے میں یہ عمارت بنی تھی۔ اس زمانے میں ہمیں معلوم ہے۔ کرین تک بھی موجود نہ تھی۔ پھر اتنے بڑے بڑے پتھر اتنی اونچائی پر کیسے لیجائے گئے؟ ہمارے ہاں پیرس میں ایفل ٹاور ہے۔ مگر وہ تو لوہے سے بنا ہے۔ پہلے سے زمین پر لٹا کر ڈھال لیا گیا تھا۔ پھر کرینوں کے ذریعہ سیدھا کر لیا۔ یہ قطب مینار؟ ـــــ" اس نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

میں نے کہا "اس کی تعمیر کے متعلق وثوق سے میں بھی کچھ نہیں بتا سکتا۔ دراصل دلی کی ہر چیز کے متعلق ہر چیز پر اسرار سی معلوم ہوتی ہے۔ اب اس قطب مینار کو ہی لیجئے، ایک روایت یہ ہے کہ اسے زمین پر لٹا کر تیار کیا گیا۔ بعد میں رسّے باندھ کے کھڑا کر دیا گیا۔"

"ونڈرفل!" فرانسیسی نے کہا۔

ایک روایت جو زیادہ معتبر ہے وہ یہ ہے کہ یہ مینار جہاں پر واقع ہے۔ وہاں پر کسی زمانے میں ایک پہاڑی تھی۔ سنگ سرخ کی۔ یہ مینار اسی پہاڑی کو کھود کھود کے تیار کیا گیا ہے۔ اور عمارتیں تو زمین کے نیچے سے شروع ہوتی ہیں اور اوپر آسمان کی طرف جاتی ہیں قطب مینار کی عمارت اوپر سے شروع ہوتی اور کھودتے کھودتے زمین کے اندر چلی گئی۔"

"سبحان اللہ۔"

"اور جب یہ عمارت بن گئی۔ تو پہاڑی کے باقی ماندہ حصے کو کاٹ کوٹ کر پھینک دیا گیا۔ اب صرف قطب مینار یہاں پہ کھڑا ہے

"بجا فرماتے ہیں آپ۔ دوسری روایت معتبر معلوم ہوتی ہے کیونکہ دلی شہر میں اکثر مقامات پر ابھی تک ایسی پہاڑیاں باقی ہیں میرا خیال ہے کہ قطب مینار ہی نہیں بلکہ پورا دلی ہی اسی طرح پہاڑیوں کو اوپر سے نیچے کاٹ کاٹ کے بنایا گیا ہے۔ جب ہی تو اس کی عمارتیں باہر ایسی سرخ اور اندر سے اتنی تاریک ہیں۔ ایک پہاڑی گنگا کی طرح۔ واہ، واہ، واہ! آپ نے کیا بات سمجھائی ہے۔

میں نے کہا "پھر ایک نکتہ اور بھی ہے۔ اور ہمارے بزرگوں کی عقل کی دلیل ہے۔ وہ ہماری پہاڑیوں کو کاٹ کاٹ کے عمارت تیار کرتے تھے۔ اور آجکل جب سائنس اسقدر ترقی کر چکی ہے کہ عمارت بنانے کے لئے چونہ، گارا، سیمنٹ، اینٹ، پتھر، گرڈر لکڑی۔ ہر چیز الگ الگ ملتی ہے تو ایک مکان بھی تیار نہیں ہو سکتا۔ آپ ہی بتایئے حکومت ہند کی بزار کوشش کے بعد نئی یا پرانی دلی میں گذشتہ چھ برس میں ایک مکان بھی تعمیر ہوا ہے۔؟"

"نہیں! نہیں! ــــ مگر ــــ میں تو فرانسیسی ہوں۔ آپ لوگوں کی سیاست میں کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتا۔ یہ آپ کی آزادی کا معاملہ ہے۔ آپ چاہے مکانوں میں رہئیے۔ چاہے باہر پلے سے مر جایئے۔۔ اڈیو۔ موسیو میں دو تین روز میں فرانس چلا جاؤنگا ممکن ہے پھر آپ سے کبھی ملاقات نہ ہو۔ بے حد شکریہ!"

ــــــ ۳ ــــــ

مگر اس واقعہ کے دوسرے روز کیا دیکھتا ہوں کہ میرے ڈرائنگ روم میں پروفیسر صاحب دھرے ہوئے ہیں۔

میں نے پوچھا "کیا ہوا صاحب۔ جہاز میں جگہ نہیں ملی۔!"

"نہیں۔ موسیو آپ بڑا نہ مانیئے گا۔ ایک اور مسئلہ آن پڑا ہے اور اس قدر اہم ہے کہ فرانسیسی حکومت نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں ضرور اس کا بھید معلوم کروں۔ کیا آپ ہماری مدد کریں گے؟"

میں نے کہا "کیوں نہیں۔ اگر ممکن ہو سکا تو"

"صاحب وہ مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے"

"آپ بتایئے تو"

"صاحب یوں تو ہندوستانی بازار میں بہت سی مٹھائیاں ملتی ہیں۔ لیکن اس "جلیبی" کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "میری دلپسند مٹھائی ہے"

فرانسیسی چٹخارہ لیتے ہوئے بولا "پسند تو مجھے بھی بہت ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس میں رس کیسے بھرا جاتا ہے!"

"خاموش! خاموش!" میں نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا ہوا!" فرانسیسی پروفیسر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

میں نے کہا "یہ ہمارا قومی راز ہے۔ اگر میں نے آپ کو بتا دیا۔ تو حکومت مجھے پھانسی پر چڑھا دیگی"

موسیو شیفر میرے پاؤں پر گر پڑے۔ گڑگڑا کر بولے "آپ کا راز میری روح میں دفن رہیگا۔ میں یسوع مسیح کی قسم کھاتا ہوں۔ یہ ــــ یہ لیجئے بیس ہزار فرانک، خدا کے لئے بتا دیجئے۔ دراصل بات یہ ہے کہ پیرس میں بہت سے ہندوستانی حلوائی پہنچ گئے ہیں اور وہ لوگ جلیبی تیار کرتے ہیں۔ اور اب پیرس کا یہ حال ہے کہ لوگ جلیبیوں پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ اور ہماری فرانسیسی مٹھائیوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ خدا کے لئے غریب فرانس کی مدد کیجیئے"

میں نے فرانک جیب میں ڈالتے ہوئے کہا "سنئے موسیو شیفر۔ ماہر فن آپ ہیں۔ میں نہیں ہوں۔ پہلے آپ بتلایئے آپ کی اس بارے میں ریسرچ کا کیا عالم ہے؟"

موسیو شیفر نے کہا "صاحب میری سمجھ میں خاک نہیں آتا۔ میں نے کئی بار جلیبی کا معائنہ کیا۔ یہ موقع کے کہیں سے

نونٹن پن کی طرح کا کوئی ایسا آلہ تو نہیں لگا ہُوا۔ کہ جس سے رس خود بخود جلیبی کے اندر چلا جاتا ہے۔ مگر ہزار بار معائنہ کرنے پر اور جلیبی کو محدّب شیشے میں دیکھنے اور اسے خوردبین سے دیکھنے پر بھی کسی سیفٹی پن کا انکشاف نہ ہُوا۔ اب یہ جلیبی شکل و صورت میں بھی ایسی ٹیڑھی میڑھی شئے ہے کہ اس کی ابتدا انتہا کا بھی پتہ نہیں ملتا۔ ورنہ میں ماہرِ فن ہوں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کسی چیز کی ماہیت دریافت کرنے کے لئے دو ہی طریقے ہیں یا تو آدمی ابتدا سے چلے اور انتہا تک جائے یا اس کی انتہا سے شروع ہو اور ابتدا تک پلٹ کر جائے۔ یہاں تو ابتدا انتہا دونوں راستے بند ہیں۔ عقل کیا کام کرے ؟"

میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا "اب میں آپ پر وہ قیمتی راز افشا کرتا ہوں۔ جو ہندوستانی تہذیب و تمدن کا مرکز ہے ہماری تجارت کا ملجا و ماوا ہے، ہمارے سیاستدانوں کا مرغوب شغلہ ہے۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ جلیبی میں رس کیسے بھرا جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کو یہ بھی بتاؤں گا کہ رس گلے میں رس کیسے بھرا جاتا ہے تاکہ اس کے بعد آپ غریب خانہ پر دوبارہ قدم رنجہ فرمانے کی تکلیف نہ کریں۔ اور مع اپنے پشتارۂ علم کی تدوین کے سیدھے پیرس چلے جائیں ؟

"سنئے۔ جلیبی میں رس بھرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک قدیم۔ دوسرا جدید"

"قدیم طریقہ تو بڑا سیدھا ہے اور اکثر حلوائی جو قدامت پسند ہیں۔ بلکہ یوں کہئے جو رجعت پسند ہیں۔ وہ میدے کو گھول کر سیدھی پنسل کی طرح جلیبی بنا لیتے ہیں اور اس کا منہ کھول کر اس میں ایک چراغ سے رس اندر انڈیل کر اس کا منہ بند کر کے اُسے پھر ہاتھ سے گول کر دیتے ہیں اور پھر اُسے گھی یا تیل یا بناسپتی میں تل لیتے ہیں ؟

"دوسرا طریقہ !"

"ہاں ! ہاں ! دوسرا طریقہ۔ خدارا جلد بتایئے میں بے تاب ہو رہا ہوں"

"دوسرا طریقہ جدید ہے۔ یعنی نیا ہے۔ اسے ترقی پسند حلوائی استعمال کرتے ہیں۔ جلیبی ٹیڑھی میڑھی بنا کے تل لی جاتی ہے۔ اور بعد میں اس میں رس بھرا جاتا ہے۔"

"مگر کیسے ! کیسے ؟"

"انجکشن کے ذریعہ !"

"انجکشن !۔ او مائی گاڈ ! فرانسیسی اچھل پڑا۔ "میں کس قدر احمق ہوں ! کتنا آسان طریقہ ہے۔ جلیبی میں رس بھرنے کا۔ او مائی گاڈ !"

فرانسیسی ماہرِ فن پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ پیرس پہنچکر اُس نے مجھے خط بھی نہیں لکھا۔ پیرس پہنچکر اس نے ایک کتاب ضرور لکھی ہے۔ ہندوستان کے تین سربستہ راز۔ ساڑھی۔ قطب مینار، جلیبی۔ یہ اس کتاب کا عنوان ہے۔ اس کتاب نے دنیائے مغرب میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔ اور اب موسیو شیفر کا شمار دنیا کے مشہور ترین عالموں میں ہوتا ہے۔ اس کتاب میں میرا ذکر کہیں نہیں ہے۔ موسیو شیفر نے خود اپنی پچیس سالہ ریسرچ سے ہندوستان کے ان رازہائے درون پردہ کا انکشاف کیا ہے۔ موسیو شیفر آجکل اکاڈمی فرانسے کے ممبر ہیں اور امسال نوبل پرائز بھی حاصل کر چکے ہیں۔

خواجہ احمد عباس

یاد نہ کر دلِ حزیں......!

"اچھا تو آپ لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں کیوں ہنس رہا ہوں؟"

"آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ایک قریب مرگ انسان کس طرح ہنس سکتا ہے، یہی ہے نا؟"

"ڈاکٹر صاحب آپ فکر نہ کیجئے، اپنی ڈسپنسری میں تشریف لے جائیے، اور اپنے کونین کے مکسچر اور اسپرین کی گولیوں کو فروخت کیجئے، آپ موت کے پنجہ سے مجھے نہیں بچا سکتے، اب مجھے کوئی شخص نجات نہیں دلا سکتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے صرف ایک ہی نہیں بلکہ دو کاری زخم لگے ہیں، ——— ایک پسلیوں میں جو کمر سے جگر تک اترتا چلا گیا ہے اور دوسرا پیٹ میں؛ کیا آپ نہیں دیکھ رہے کہ آنتیں باہر نکل رہی ہیں؟ ———

"اچھا تو آپ لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ میں ہنس کیوں رہا ہوں؟ ——— آپ حیران ہیں کہ یہ کس قسم کا مذاق ہے جو ایک دم توڑتے ہوئے انسان کو اس کے آخری لمحات میں بھی ہنسا رہا ہے؟ میں بتاتا ہوں، سنئے، بات یہ ہے کہ مجھے اس وقت یہ یاد آگیا ہے کہ میں کون ہوں ——— "

"بھائی آپ کیا کہتے ہیں، اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے، ذرا ٹھہریئے، پوری کہانی سن لیجئے، پھر آپ کو یقین آجائیگا کہ میں مرتے وقت بھی کیوں ہنس رہا ہوں ———؟"

"دو ماہ سے میں برابر اپنے کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں کون ہوں، ہندو ہوں یا مسلمان یا سکھ جس کی شاید جبراً ڈاڑھی مونچھیں مونڈ دی گئی ہیں اور ختنہ کر دی گئی ہے، ——— برہمن ہوں یا اچھوت؟ امیر ہوں یا غریب؟ مشرقی پنجاب کا ہوں یا مغربی پنجاب کا؟ لاہور کا رہنے والا ہوں یا امرتسر کا؟ راولپنڈی کا یا جالندھر کا؟ نہ صرف خود میں نے بلکہ کئی دوسرے لوگوں نے بھی مجھے پہچاننے، میری ذات، میرا مذہب اور میرا نام معلوم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن کسی پر یہ راز منکشف نہیں ہو سکا، لیکن مجھے خود یاد نہیں رہا، پھر بھی میں نے برابر کوشش کی، لیکن اب اچانک میری یادداشت واپس آگئی ہے ——— اب جبکہ میں دم توڑ رہا ہوں ———!

"ڈاکٹر مجھے اس قدر حیران اور پریشان نظروں سے نہ دیکھو، اس سے مجھے اور ہنسی آتی ہے، واقعی آپ کی پریشانی میری کسی کام کی نہیں۔ اب مجھے دنیا میں کوئی ڈاکٹر نہیں بچا سکتا ———!"

"میں جانتا ہوں آپ اس قدر کیوں فکرمند ہیں۔ میں آپ کے عمل جراحی کے مسئلہ کو سمجھتا ہوں۔ مجھے چھرے کے دونوں زخم اس قدر کاری لگے ہیں کہ آپ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ پہلے کس طرف متوجہ ہونا چاہئے، اگر آپ مجھے پیٹھ کے بل لٹا کر آنتیں اندر رکھ کر پیٹ کو سینا چاہیں گے تو میرا تمام خون پیٹھ کے زخم سے اتنی تیزی کے ساتھ بہہ جائیگا کہ آپ ایک ٹانکا بھی نہ لگانے پائیں گے اور میری روح پرواز کر جائے گی، اگر آپ مجھے پیٹھ کا زخم سینے کے لئے اوندھا لٹائیں گے تو تمام آنتیں حتیٰ کہ جگر اور گردے بھی شکم سے باہر نکل پڑیں گے۔ اس لئے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، اس کے بجائے میری بھولی ہوئی کہانی سن لیجئے، ———

"دو ماہ ہوئے کئی دنوں کی غشی اور بحران کے بعد مجھے ہوش آیا اور میں نے اپنے آپ کو نئی دہلی کے ایک سرکاری

ہسپتال میں پایا ———— !

"تمہارا نام؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

میں نے بہت سوچا، اپنے معطل دماغ پر زور ڈالا مگر مجھے یہی کہنا پڑا "معاف کیجئے یاد نہیں آتا"

"ہندو یا مسلمان؟"

ڈاکٹر نے دوسرا نازک سوال پوچھا اور مجھے پھر کہنا پڑا کہ "یہ بھی یاد نہیں"

"مجھے اپنی ماضی کے متعلق کچھ یاد نہیں آیا، نہ مذہب نہ ذات۔ نہ گھر نہ بیوی نہ بچے۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں شادی شدہ ہوں، مجرد ہوں یا کنوارا۔ مجھے اپنی عمر کا بھی کوئی احساس نہیں تھا۔ بہرکیف اتنا خیال ضرور تھا کہ میں جوان ہوں گا لیکن جب میں نے آئینہ دیکھا تو مجھے ایک جھرّیوں دار بالوں سے اٹا ہوا نہایت ڈراؤنا چہرہ نظر آیا جو بالکل اجنبی تھا، اس سے پہلے میں نے کبھی ایسا چہرہ نہیں دیکھا تھا، ————

نئی دہلی کے ڈاکٹروں نے میری یادداشت کو واپس لانے کے لئے بڑی کوشش کی جس میں وہ بُری طرح ناکام رہے، میں نے دماغ پر بہت زور ڈالا کیونکہ نام کے بغیر مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے واقعی میرا وجود ختم ہو گیا ہو، جیسے میں مرگیا ہوں، ———— پوچھ گچھ کرنے پر پتہ چلا کہ مجھے پنجاب کے چند زخمی پناہ گزینوں کے ساتھ لایا گیا تھا، جن میں سے زیادہ تر ہسپتال میں چل بسے تھے، جب میں نے پوچھا کہ دوسرے لوگ ہندو، سکھ یا مسلمان تھے تو مجھے بتایا گیا کہ وہ تینوں فرقوں سے تعلق رکھتے تھے، واقعہ یہ ہوا تھا کہ امرتسر اور لاہور کے درمیان یکے بعد دیگرے پناہ گزینوں کی دو اسپشل گاڑیوں پر حملہ کیا گیا اور انھیں پٹری سے گرا دیا گیا، ایک ٹرین میں ہندو پناہ گزین مغربی پنجاب سے امرتسر آرہی تھی اور دوسری میں مسلمان پناہ گزین مشرقی پنجاب سے جبکہ ٹرین ایک پُل پر سے گذر رہی تھی پٹری پر ایک بم زور سے پھٹا، انجن پٹری سے نیچے اتر گیا اور اپنے ساتھ کئی ڈبوں کو نالے میں کھینچتا ہوا لے گیا، کئی ہلاک و مجروح ہوئے، اور پیچھے کے ڈبوں میں جو لوگ بچ گئے، اُن پر جنگل میں چھپے ہوئے ڈاکوؤں کے ایک جتھے نے گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی، مجروحین اندھیرے میں پناہ لینے اِدھر اُدھر بھاگ نکلے، ایک گھنٹہ کے بعد مخالف سمت سے آنیوالی ٹرین کو اسی قسم کا حادثہ پیش آیا۔ اس گاڑی کے زخمیوں نے بھی قریب کے جنگل میں پناہ لی اور بہت سے اندھیرے میں ٹھوکریں کھا کھا کر جاں بحق ہو گئے، دوسرے دن صبح جب انڈین یونین اور پاکستان کی فوجیں دونوں طرف سے گشت کے لئے آئیں تو انھیں نئی سرحدی لائن پر دونوں ٹرینوں کے نیچے لاشوں کے انبار نظر آئے اور زخمیوں کی کراہ سنائی دی، یہ اس قدر جلے بھنے پڑے ہوئے تھے کہ ان میں ہندو مسلمان کی تمیز کرنا مشکل تھا، میں بھی اُن میں سے ایک تھا، اور ایک اسٹریچر والے نے جو مجھے ایمبولینس تک لے گیا بتایا کہ میں کس طرح بیہوشی کے عالم میں ———— خون آلود شلوار اور قمیص میں لپٹا ہوا سرحد پر پڑا تھا کہ میری ٹانگیں پاکستان میں اور باقی حصہ انڈین یونین میں تھا اور نئی سرحدی لائن جو ایک کھیت سے گذرتی تھی خون میں ڈوبی ہوئی تھی! - ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کا خون جو ایک دوسرے میں مل گیا تھا اور ایک ایک قطرہ زمین میں پیوست ہو گیا تھا، ناقابلِ امتیاز، ناقابلِ شناخت اور ناقابلِ تقسیم تھا، ———— !

"سفید ریش نحیف مولانا مجھے کڑی نظروں سے نہ دیکھئے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں، یہ نہ بھولئے کہ میں مر رہا ہوں، اور مرتے وقت انسان کو سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ آپ شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں اپنے کو مسلمان بتاؤں گا تاکہ میرے مرتے ہی آپ اپنی انجمن خدام المسلمین کی جانب سے میری تجہیز و تکفین کے انتظامات شروع کر سکیں، اور آپ کو مہاشے جی جو اپنے چٹیل سر پر اس قدر گہرا تلک لگائے ہوئے ہیں، میں خوب سمجھتا ہوں، آپ اس کے منتظر ہیں کہ میں اپنے کو ہندو ظاہر کر دوں تو آپ دھرم سیوک سنگھ کی طرف سے میرے آخری رسوم کی ادائیگی کی

ذمہ داری سنبھال لیں، ـــــــــ میں نے سنا ہے کہ یہاں بمبئی میں پارسی لوگ اپنے مردوں کو اندھے کنوئیں میں رکھدیتے ہیں جنھیں گدھ اپنی خوراک بنا لیتے ہیں اور یہ منحوس پرندے ہر وقت وہاں لاش کے انتظار میں منڈلایا کرتے ہیں۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ انسانی گدھ بھی ہوتے ہیں جو مرنے سے پہلے ہی جاں بلب آدمی کی تاک میں رہتے ہیں ـــــــــ،

"خیر آپ تو میری داستان سنتے جایئے، کیونکہ باتوں کے لئے اب میرے پاس وقت نہیں ہے، میرے زخم شدید نہیں تھے، چنانچہ دس پندرہ دن میں اچھے ہوگئے، لیکن ڈاکٹروں نے بتایا کہ میرے دماغ کو اندرونی صدمہ پہنچا ہے جس سے میری یادداشت کی قوت سلب ہوگئی ہے، میں بغیر نام کا ایک عجیب آدمی بن گیا۔ ہندستان اور پاکستان کے اخبارات میں میری تصاویر بھی شائع ہوئیں، لیکن کسی بھی رشتہ دار، دوست، شناسا یا ہمسایہ نے مجھے شناخت نہیں کیا۔ غالباً وہ سب مر چکے تھے، شاید میں اس دنیا میں اکیلا تھا۔ اس دوران میں جب بیمار اور زخمی پناہ گزینوں کا ایک نیا جتھا آیا، تو ہسپتال کے ڈاکٹروں نے مجھ سے صاف کہدیا کہ وہ مجھے اب وہاں رکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ میں وہاں سے اس امید پر چل پڑا کہ شاید کہیں پناہ کی جگہ مل جائے۔ تمام شہر میں گھوم پھر آنے کے بعد میں جامع مسجد پہنچا، جہاں سامنے کے میدان میں پناہ گزینوں کا ایک کیمپ لگا ہوا تھا۔

میں نے کیمپ انچارج سے کہا "میں غریب الدیار اور مفلوک الحال ہوں، تھوڑی سی جگہ مجھے بھی کہیں دیدیجئے"

اس نے پوچھا "ہندو ہو یا مسلمان؟"

میں نے جواب دیا "مجھے یاد نہیں" اور واقعہ بھی یہی تھا، میں جھوٹ بولنا نہیں چاہتا تھا،

کیمپ انچارج نے مجھے حقارت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا "یہ کیمپ صرف مسلمانوں کے لئے ہے"

خاک آلود سڑکوں پر گھومتا ہوا میں نئی دہلی جا پہونچا، یہاں مجھے ایک بہت بڑا کیمپ نظر آیا۔ چنانچہ میں وہاں پہنچ گیا اور ایک رضاکار سے پناہ دینے کے لئے کہا، مجھ سے مارے نقاہت کے بولا نہیں جا رہا تھا۔ کیونکہ میں تین دن کا بھوکا تھا۔

مجھ سے پوچھا گیا "ہندو ہو یا مسلمان؟"

مجھے پھر کہنا پڑا "نہیں معلوم"

"نام؟"

"یہ بھی یاد نہیں، مجھے کچھ بھی یاد نہیں آتا"

"تو پھر کہیں اور جاؤ، یہ کیمپ صرف ہندوؤں کے لئے ہے"

اس طرح میں ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ تک بھٹکتا پھرا، ہندوؤں کے لئے پناہ گزین کیمپ تھے، مسلمانوں کے لئے پناہ گزین کیمپ تھے، لیکن انسانوں کے لئے کچھ نہ تھا۔

"اس رات میں تکان سے چور سڑک پر ایک بنگلے کے سامنے بیہوش ہو کر گر پڑا۔ یہ بنگلہ ایک سکھ سردار صاحب کا تھا، جو سکریٹریٹ میں کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے، مجھے مفلس اور محتاج دیکھ کر وہ اندر لے آئے، اور پینے کے لئے کچھ دودھ دیا، مجھے جب پوری طرح ہوش آیا تو انھوں نے یہ نہیں پوچھا کہ آیا میں ہندو ہوں یا سکھ یا مسلمان، انھوں نے صرف اتنا کہا "اب بھائی تمھاری طبیعت کیسی ہے؟" کئی روز تک وہاں رہا، سردار صاحب، ان کی بیوی اور ان کے بچے سب مجھ پر مہربان تھے۔ میں نے واقعی طور پر اپنے حالات انھیں بتا دیئے تھے کہ مجھے اپنے متعلق کوئی علم نہیں ہے، لیکن پھر بھی وہ میرے ساتھ اچھی طرح پیش آتے تھے بہرکیف چند روز بعد راولپنڈی ڈسٹرکٹ سے ان کے کچھ رشتہ دار ایک اسپشل ٹرین میں آئے۔ ان میں سے بعض کو مسلمان حملہ آوروں کے ہاتھوں شدید مصائب اٹھانا پڑے تھے، انھیں جبراً مسلمان کیا گیا، ان کے بال کاٹے گئے اور ختنہ کی گئی،

ان کی عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ انھوں نے اپنے رشتہ داروں اور ہمسایوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے ہوئے دیکھا تھا، اس لئے ان کے دل نفرت اور تلخی سے بھرے ہوئے تھے، ان کے حالات سُنکر مجھے مسلمانوں سے نفرت ہو نے لگی،

"سردار صاحب نے انھیں میرا عجیب وغریب حال بتایا کہ میری یادداشت کس طرح کھو گئی ہے۔ ان میں سے بڑے بوڑھوں نے مجھے تسلی دی مگر نوجوانوں نے مجھے مشتبہ نظر سے دیکھنا شروع کر دیا اور ایک رات میں نے یہ کہتے ہوئے سُنا " فرض کرو وہ جھوٹا ہے، اگر واقعی وہ اپنی یادداشت کھو چکا ہے تو کیا پتہ کہ مسلمان نکلے" اور مجھے ان کی آنکھوں میں خطرناک چمک نظر آئی۔

"بار بار مجھے یہ خیال آتا رہا " فرض کرو میں مسلمان ہوں!" کون جانتا ہے کہ میں نے بھی ان چیرہ دستیوں میں ہاتھ بٹایا ہو اور پھر زخمی ہو کر اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہوں، شاید خدا مجھے ان بداعمالیوں کی سزا دے رہا ہو، اسی رات میں سردار صاحب کے گھر سے بھاگ نکلا۔ پھر میرے سامنے راستہ کھلا ہوا تھا ——— اور فاقہ!۔

"یہ کیمپ مسلمانوں کے لئے ہے!"

"تم کون ہو؟"

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"سوالات! سوالات!! سوالات!!!"

اور میں کسی کا جواب نہیں دے سکا، کیونکہ میں اپنی قوتِ حافظہ سے محروم تھا، جب مجھے کہیں پناہ نہیں ملی اور بالکل چلنے پھرنے کی سکت نہیں رہی تو میں نے اپنے آپ کو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر گرا دیا، شاید یہیں میرا کام تمام ہو جائے اور ان کلفتوں سے مجھے نجات مل جائے، میں گرتے ہی بیہوش ہو گیا اور مجھے کچھ یاد نہیں رہا مجھے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ میں کب تک وہاں پڑا رہا لیکن جب میری آنکھ کھلی تو مجھے ایک چھوٹا لڑکا نظر آیا جس کی عمر ۸، ۹ سال کے لگ بھگ ہو گی۔

"اٹھو! اٹھو!!" وہ کہہ رہا تھا، "لو یہ کھانا کھا لو، میری ماں نے تمھارے لئے بھیجا ہے"

کھانے کا نام سنکر میرا تحت الشعور چونکا اور میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ لیکن مجھ میں بیٹھنے کی طاقت نہیں تھی۔ لڑکے نے مجھے سہارا دیا، اور اس طرح میں نے کچھ چپاتی اور دال کھائی، یہ سادہ کھانا کتنا مزیدار تھا!۔ میں نے کس قدر حریصانہ طریقے سے کھایا تھا۔

جب میں کھانا ختم کر چکا تو میں نے کہا "بیٹا تمھاری بڑی عمر ہو" اور جیسے ہی میں نے اُس کے ہاتھوں کو پیار سے اپنے ہاتھوں میں لیا اُس نے چیخ کر کہا "ارے تمھیں تو تیز بخار چڑھا ہوا ہے، آؤ میں تمھیں اباجی کے پاس لے چلوں، وہ حکیم ہیں، ایسی دوا دیں گے کہ تم ذرا میں اچھے ہو جاؤ گے، اس طرح چھوٹا بچہ مجھے اپنے گھر لے آیا، حکیم صاحب بڑے نیک اور خدا ترس مسلمان تھے، پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے اور جو مریض ان کے پاس آتے تھے انھیں مفت دوا دیتے تھے، خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو۔ انھوں نے مجھے کچھ یونانی دوا دی، دن میں تین بار دودھ پینے کو دیا اور سونے کے لئے ایک بستر کا بھی انتظام کر دیا۔ حکیم صاحب کی دوا سے میرا بخار اتر گیا، لیکن ان جیسا طبیب بھی میری قوتِ حافظہ کو زندہ نہیں کر سکا، میں نے انھیں اپنے اندیشے سے آگاہ کیا کہ شاید میں ہندو ہوں، اس لئے مجھے یہاں سے چلا جانا چاہئے، لیکن بزرگ حکیم صاحب نے میرے قیام پر اصرار کیا "تمھارے ہندو ہونے سے کیا ہوتا ہے" انھوں نے کہا "کیا ہندو خدا کی مخلوق نہیں ہیں" میں ٹھہر گیا، لیکن پھر کچھ ایسا واقعہ پیش آیا کہ وہاں میرا قیام ناممکن ہو گیا، ایک دن حکیم صاحب کا لڑکا کسی غریب کو معمول کی طرح کھانا دینے گیا، لیکن کئی گھنٹے ہو گئے، وہ واپس نہیں آیا۔ حکیم صاحب اور میں اُس کی تلاش میں نکلے، لیکن کوئی پتہ نہیں چلا، رات کو ہم یہ سنکر بھونچکا رہ گئے کہ جامع مسجد سے واپس ہوتے وقت جبکہ وہ دریبہ سے گذر رہا تھا، کچھ ہندوؤں نے

اسے مار ڈالا، اندرزنانہ میں صفِ ماتم بچھ گئی، حکیم صاحب کی نیک بیوی پر غشی کے دورے پر دورے پڑ رہے تھے۔ مجھے پھر وہم نے ستانا شروع کر دیا، دن رات مجھے اپنے چھوٹے دوست کی شکل گھیرے رہتی اور یہ آواز سنائی دیتی "یاد رکھو میں نے تمھیں کھانا کھلایا جبکہ تم مر رہے تھے اور پھر بھی تم نے مجھے مار ڈالا!" میں جانتا ہوں کہ میں نے اسے نہیں مارا تھا، لیکن یہ خیال میرے دماغ میں جما رہا "فرض کرو کہ میں ہندو ہوں!، فرض کرو قوتِ حافظہ زائل ہونے سے پہلے میں نے بھی حکیم صاحب کے لڑکے کی طرح مسلمان بچوں کو ہلاک کیا ہو! یہ تصور میرے لئے بلائے جان بن گیا۔ چنانچہ ایک روز علی الصباح کسی کے اٹھنے سے پہلے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ اُن دنوں دہلی میں خوف و دہشت کا راج تھا، لوگ دن کے اجالے میں قتل ہو رہے تھے، ہر طرف بڑی بڑی شاہراہوں پر بھی گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی، شہر قتل گاہ کا نمونہ پیش کر رہا تھا، میں چھپتا چھپاتا، دبا، سہما کسی طرح ریلوے اسٹیشن پہونچ گیا، میں نے سنا تھا کہ بمبئی میں نسبتاً امن ہے، چنانچہ جب مجھے فرنٹیر میل کھڑا نظر آیا تو میں اس میں جا دھمکا، کھچا کھچ بھرے ہوئے ڈبہ میں میرے قریب ایک اداس پنجابی نوجوان بیٹھا تھا، جب گاڑی روانہ ہوئی تو اس نے مجھ سے پوچھا "کون ہو بھائی تم؟"

"مجھے نہیں معلوم! شائد ہندو ہوں، شائد مسلمان!"

"میں نے سنا ہے کہ یہ راستہ مسلمان مسافروں کے لئے خطرناک ہے، کیونکہ تمھاری ڈاڑھی ہے اس لئے میں نے پوچھ لیا۔"

"میں نے اپنا سارا ماجرہ اس کو سنا دیا، لیکن پھر بھی وہ میری کئی ہفتوں کی ڈاڑھی کو ایسی مشتبہ نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ میں سمجھ گیا کہ اسے میری باتوں کا یقین نہیں پھر میں اس کے متعلق باتیں کرنے لگا، اس نے مجھے بتایا کہ کس طرح لاہور میں اس کی دکان اور گھر لوٹا گیا، اس کے کئی رشتہ دار مارے گئے اور بہت سے لاپتہ ہوگئے، اب وہ قسمت آزمائی کے لئے بمبئی جا رہا تھا، "گاڑی بھرت پور کے قریب رک گئی، اور تمام مسافر جن پر مسلمان ہونے کا شبہ تھا کھینچ کر باہر نکال لئے گئے۔ اور انتہائی بے رحمی کے ساتھ انھیں گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔"

"جب میں اس کا خیال کرتا ہوں تو مجھے اب بھی ہنسی آتی ہے، یہ سب کچھ کس قدر مضحکہ خیز تھا ——— یہ کیا تھا؟ آپ شائد یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ایسے وحشیانہ قتل و غارتگری میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ میں بتاتا ہوں ——— سنئے یہ قاتل اور وحشی درندے "مہاتما گاندھی کی جے" کے نعرے مسلمانوں کو گولی مارتے وقت یا لکڑیوں سے اُن کا گلا کاٹتے ہوئے برابر لگاتے رہے، یقیناً موت کے وقت بھی ایک آدمی کو ہنسنے کے لئے یہ کافی ہے،

"بہرحال جب یہ حملہ آور ہمارے کمپارٹمنٹ میں آئے تو میں مرنے کے لئے آمادہ ہوگیا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں مسلمان ہوں مگر میری ڈاڑھی اس کا اظہار کر رہی تھی، مجھے مارنے کے لئے یہ کافی تھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ میرا پتہ لگائیں میرے نوجوان ہمسفر نے مجھے ایک کمبل میں چھپا دیا اور جب انھوں نے میرے متعلق پوچھا تو اس نے پوری دلیری سے کہدیا "یہ میرا بھائی ہے۔ اسے مت چھیڑو، لاہور میں وہ شدید زخمی ہوگیا تھا، اس میں کسی بات کے جواب دینے کی طاقت نہیں"، چنانچہ وہ اس طرح مطمئن ہوکر چلے گئے، گولیاں چلیں اور کئی لوگوں کی کراہ سنائی دی، اور گاڑی روانہ ہوگئی۔

"آخر کار میں بمبئی پہونچ گیا، لیکن یہاں آپ کے اس پرامن شہر میں بھی وہی سوال میرے پیچھے لگ گیا،

"کیا تم ہندو ہو؟

"کیا تم مسلمان ہو؟

اور مجھے یہ خیال آیا، ہندو کون ہے؟ مسلمان کون ہے؟ وہ نوجوان جس نے ٹرین میں میری جان بچائی گو کہ میں مسلمان نظر آ رہا تھا کیا وہ ہندو ہے؟ یا وہ بیہ کے وہ غنڈے جنہوں نے حکیم صاحب کے معصوم بچے کو ہلاک کیا ——— کیا وہ ہندو ہیں؟ مسلمان کون ہے؟

—— حکیم صاحب اور ان کا [illegible] ان یا وہ وحشی اور درندے جنھوں نے بیشمار سکھوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور ان کی عورتوں کی عصمتوں سے اپنے جذبات کو تسکین پہنچائی؟ اور سکھ کون ہیں؟ —— وہ رحمدل سردار صاحب اور ان کا خاندان یا وہ جنھوں نے دہلی میں قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا؟۔

"کون مسلمان ہے؟ کون ہندو ہے؟ کون سکھ ہے؟"

"میں کون ہوں؟ —— ہندو یا مسلمان؟ دن رات یہی سوال میرا پیچھا کر رہا ہے، جب میں سونے کی کوشش کرتا ہوں اُس وقت بھی ناپاک شیطان مجھے گھیر لیتے ہیں اور سرخ تپتے ہوئے نیزوں سے ٹھوکے دے دے کر مجھ سے پوچھتے ہیں:۔ تم کون ہو؟ ہندو یا مسلمان؟ مسلمان یا ہندو؟ اور میں خواب ہی میں چیخ اٹھتا ہوں "مجھے اکیلا چھوڑ دو، مجھے نہیں معلوم میں کون ہوں میں ہندو نہیں ہوں، میں مسلمان نہیں ہوں، میں سکھ نہیں ہوں۔ میں ان میں سے کچھ نہیں ہوں، میں صرف انسان ہوں"

"بمبئی میں بھی پناہ گزینوں کے کیمپ ہیں اگر آپ سکھ ہیں تو سیدھے خالصہ کالج تشریف لے جائیے، اگر آپ ہندو ہیں تو رام کرشن آشرم میں پناہ لیجئے، اگر آپ مسلمان ہیں تو انجمن اسلام ہائی اسکول کا راستہ سنبھالئے، لیکن میں کہاں جاؤں —— میں جو اپنے متعلق کچھ نہیں جانتا —— میرے لئے کہیں گنجائش نہیں!!۔

"میں بھیک سے بھی محروم ہوں، بھیک دینے سے پہلے ہر شخص جاننا چاہتا ہے کہ وہ صحیح فرقہ سے تعلق رکھتا ہے یا نہیں، لیکن میں کسی فرقہ سے تعلق نہیں رکھتا! لیکن کیا میں بھوکوں مروں؟ نہیں! نہیں!! کسی طرح مجھے معلوم کرنا چاہیئے کہ میں دراصل ہوں کون؟ اس کے بغیر زندہ رہنے کا کوئی موقع ہی نہیں"

کسی نے مجھے مشورہ دیا کہ "ڈاکٹر سامانی کے پاس جاؤ" صرف وہی تمھاری قوت حافظہ ٹھیک کر سکتے ہیں۔ آپ سب ڈاکٹر سامانی کو جانتے ہی ہوں گے، وہ اپنے کو معالجۂ دماغی کا محقق کہتے ہیں۔ وہ اپنے مریضوں کا علاج نہ صرف اپریشن کے ذریعہ بلکہ اُن سے باتیں کر کے اور باتیں کرا کے بھی کرتے ہیں، چنانچہ میں ان کے پاس پہنچا۔

کمرہ کچھ عجیب لطیف روشنی سے پُر تھا، دیواریں سفید تھیں، ڈاکٹر کا کوٹ اور نرس کا لباس بھی ایسا ہی تھا، ہر چیز سفید، صاف اور نرم تھی، لیکن سب سے زیادہ ڈاکٹر کی آواز نرمی میں ڈوبی ہوئی تھی، اُنھوں نے نہایت نرمی سے کہا "اب اپنے دماغ کو ڈھیلا کر دو، —— اس پر کوئی زور نہ ڈالو اور پھر جو تمھارے ذہن میں آئے بولنا شروع کر دو، کوئی پروا کی بات نہیں خواہ وہ کیسی ہی بات ہو، اس کے بعد وہ کاغذ اور پنسل لیکر میری باتیں لکھنے کے لئے بیٹھ گئے، میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دماغ کو گھومنے دیا۔ "نیلا آسمان" میں نے کہنا شروع کیا جیسے مجھے پچھلے واقعات کا گہرا احساس ہو رہا ہو "نیلا آسمان —— افق تک پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب کھیت ——"

"شاباش! شاباش!!" ڈاکٹر نے کہا، مجھے پنسل کی سرسراہٹ کاغذ پر سنائی دی، "رکو مت، بولے جاؤ"

میں اپنے دماغ میں آنے والے مختلف تاثرات ظاہر کرتا رہا "نیلا آسمان، سرسبز و شاداب کھیت، ایک دریا۔ بارش میں طغیانی، دریا میں کشتیاں، —— ایک نہر —— بچے نہر میں نہا رہے ہیں کھیل رہے ہیں ——، ایک دوسرے پر پانی اُچھال رہے ہیں، اور بچوں میں، ایک بچہ کی حیثیت سے میں بھی کھیل رہا ہوں اور پانی اُچھال رہا ہوں ——"

"یہ بچے کون ہیں؟" بہت دور سے ڈاکٹر کی آواز سنائی دی، "ہندو بچے، مسلمان بچے، یا سکھ بچے!"۔

"صرف بچے" میں نے اپنے کو یہ کہتے سنا۔

"اچھا بولتے جاؤ!"

"فصل کٹنے کے بعد میدان ——— سنہری بالوں کا بڑا انبار، آسمان تک اونچا ——— بیساکھی کا تہوار
جشن ——— سنو ——— سنو ——— ڈھولک ——— اور گیت"

"یہ گیت کون گا رہا ہے؟"

"عورتیں"

"ہاں! ہاں! ہندو عورتیں یا مسلمان عورتیں یا سکھ عورتیں؟"

"پنجابی عورتیں ——— ہندو، سکھ، مسلمان"

مجھے ڈاکٹر مایوسی کی سانس لیتا ہوا سنائی دیا۔

"اچھا! اچھا" اس نے کہا "بولے جاؤ!"

"لیکن اب مجھے سنائی نہیں دے رہا، مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا، مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا"

"کیوں! کیوں!! کیا بات ہے!"

"میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے، سر پھٹا جا رہا ہے، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو گیا ہے، ——— ایک عجیب و غریب شور سنائی دے رہا ہے ———"

"ہاں کوشش کرو! کوشش کرو، اب تمھیں کچھ نظر آ رہا ہے ———؟"

"ہاں اب دکھائی دے رہا ہے، آگ کے شعلے آسمان تک لپک رہے ہیں، سارا گاؤں جل رہا ہے۔ شور بڑھتا جا رہا ہے چیخ پکار تیز ہو رہی ہے، عورتیں چیخیں مار رہی ہیں ———"

"ٹھیک ہے یہ فسادی ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے تمھارے خاندان کو ہلاک کیا ہے، جنھوں نے تمھارا گھر جلایا ہے، جنھوں نے تمھارا ذہنی توازن بگاڑ دیا ہے ———"

"اب میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، بہت شور بڑھ گیا ہے، صرف ایک لفظ سنائی دے رہا ہے ——— مارو! مارو!! ڈاکٹر مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!"

"دیکھو دیکھو، اب غور سے سنو اور یاد کر دیہ کون لوگ ہیں۔ کون لوگ تمھارے گھر کو جلا رہے ہیں اور رشتہ داروں کو مار رہے ہیں؟ تمھیں بدلہ لینا ہوگا ——— انتقام"

"اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ دماغ مجھے آگاہ کر رہا ہے ——— اب ڈاکٹر معلوم کر لیگا کہ میں ہندو ہوں، یا مسلمان یا سکھ! اب! اب!"

"میں مسلمان ہوں، میں نے سردار صاحب کے رشتہ داروں کو ہلاک کیا ہے، اس پنجابی ہندو نوجوان کی دکان لوٹی ہے، جس نے ٹرین میں میری جان بچائی تھی، ——— میں نے ہزاروں ہندوؤں اور سکھوں کو مارا ہے ———"

"میں ہندو ہوں، میں نے حکیم صاحب کے لڑکے اور دوسرے ہزاروں مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہلاک کیا ہے ——— نہیں! نہیں!! میں زور سے چیخا، میں یہ جاننا نہیں چاہتا کہ میں کون ہوں؟ میں ہندو یا مسلمان یا سکھ بننا نہیں چاہتا، میں صرف ایک انسان رہنا چاہتا ہوں، میں نے اپنی آنکھیں ایک جھٹکے کے ساتھ کھول دیں جس سے ڈاکٹر کی نرم اور شیریں آواز کا طلسم ٹوٹ گیا۔ میں مشاورتی کمرہ سے بھاگ نکلا، ڈاکٹر ششدر رہ گیا،

"میں ہندو ہوں؟"

"میں مسلمان ہوں؟"

"میں مسلمان ہی ہوں!"

"میں ہندو ہی ہوں!"

"میں ہندو ہوں، میں مسلمان ہوں!"

"میں کیا ہوں؟ میں کیا ہوں؟"

"میں کچھ بھی نہیں، میں کچھ بھی نہیں!"

"میں ہندو ہوں، میں مسلمان ہوں!"

میں بھاگا چلا جا رہا تھا، جیسے میں پلینگ سے بچ کر فرار ہو رہا ہوں، مگر یہ آوازیں جہاں بھی میں گیا برابر میرا پیچھا کرتی رہیں مجھے معلوم نہیں کہ میں کس محلے سے گذر رہا تھا کہ ایک لمبے تڑنگے آدمی نے روک کر پوچھا:

"اے سالا کہاں جاتا ہے؟ کون ہے بے؟"

وہ مسلمان موالی تھا، مجھے اُس کی آنکھوں میں خون نظر آ رہا تھا، اور ہاتھوں میں ایک تیز چھرا چمک رہا تھا، لیکن میں اپنے سپنے میں اس قدر اُلجھا ہوا تھا کہ برابر کہے جا رہا تھا "میں ہندو ہوں —— میں مسلہ ——" ابھی میں نے مسلمان کا لفظ پورا دا بھی نہیں کیا تھا کہ اُس کا چھرا میری پیٹھ میں اتر گیا، یہ وہی زخم ہے جو آپ کو نظر آ رہا ہے۔ جیسے ہی میں چکرایا —— مجھے سنائی دیا "کافر کا بچہ!" میں نے بڑی مشکل سے اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کی اور آگے بڑھ گیا، اگرچہ میرے پیچھے تازہ خون کی سُرخ دھار بہے جا رہی تھی۔ آپ اس پر یقین نہیں کر سکتے، نہ کیجئے۔ خیر، مجھے مرتے وقت آپ کے صداقت نامہ کی ضرورت نہیں!۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں برابر چلتا رہا، ٹھکتا، اور لڑکھڑاتا ہوا میں ایک دوسرے محلہ میں جا پہنچا، اب کے مجھے ایک ہندو غنڈے نے للکارا "اے بے کون ہے؟ ہندو یا مسلمان؟" اس نے اپنے کپڑوں میں سے ایک کھوکری نکالتے ہوئے پوچھا۔ میں برابر اپنا وہی خطرناک وظیفہ دہرا رہا تھا "میں مسلمان ہوں —— میں ہند ——" اور اس دفعہ ہندو کا لفظ پورا ہونے سے قبل ہی تیز پھل نے میرا پیٹ چیر ڈالا —————"

"اب آپ کو معلوم ہوگیا کہ یہ دو زخم کس طرح آئے، مجھے ایک مسلمان، اور ایک ہندو دونوں نے چھرے سے زخمی کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب آپ مجھے نہیں بچا سکتے، اور نہ آپ میں سے کوئی مجھے نجات دلا سکتا، —— آپ جو میرے مرنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں —— سچ تو یہ ہے کہ آپ میں سے مجھے کوئی بھی بچانا نہیں چاہتا، آپ میں سے ایک بھی نہیں، بیشک آپ میرے قتل کا انتقام ضرور لیں گے۔ اگر میں آخر وقت میں، اپنے کو ہندو ظاہر کر دوں تو یہ بہادر ہندو فوراً بدلہ میں چار بے گناہ مسلمانوں کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیں گے اور اگر میں اپنے کو مسلمان بتا دوں تو یہ دلیر مسلمان پوری ہندو قوم سے بدلہ لینے پر تل جائیں گے، ——————

"اور اب میں ہنس رہا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ میں کون ہوں، اب میری تمام قوتِ حافظہ واپس آگئی ہے —————— میری بیوی کی خوبصورت آنکھیں، معصوم بچہ کا کھیل، یہ دونوں میری آنکھوں کے سامنے مارے گئے، اسی لئے میری قوتِ حافظہ زائل ہوگئی، ہاں اب مجھے ہر چیز —————— میرے کھیت، میرا گاؤں، میرے دوست میرے ہمسائے —————— یاد آگئے ہیں جبکہ میں مر رہا ہوں۔ مرتے وقت ہر شخص کو تمام باتیں یاد آ جاتی ہیں۔

لیکن تم میرے دوستو، بیکار میرا انتظار کر رہے ہو، میں کبھی نہیں بتاؤں گا کہ آیا میں ہندو ہوں یا مسلمان، نہ ہی میرا مسلمان قاتل اور نہ ہی میرا ہندو حملہ آور کبھی یہ جان سکیگا کہ کسی نے اپنے ہی فرقہ کے ایک آدمی کو غلطی سے مار ڈالا —————— یہ میرا انتقام ہے، نہ صرف ان سے بلکہ اُن تمام ہندوؤں، مسلمانوں، اور سکھوں سے جنھوں نے میری طرح ہزاروں انسانوں کو

(باقی صفحہ ۱۱۰ پر ملاحظہ فرمائیے)

ابراہیم جلیس

(ایک سلیس عام فہم کہانی)

آدم خور

(دس سال سے زائد عمر کے بچوں کے لئے)

کسی زمانہ میں اسی ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ اتنا عادل اور منصف مزاج تھا کہ اس نے کبھی شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پر پانی نہیں پینے دیا تاکہ کہیں پانی پینے کے بہلنے شیر بکری کو ہڑپ نہ کر جائے۔ وہ اتنا رعایا پرور تھا کہ اس کی ساری رعایا فاقے کرتی ننگی رہتی اور بھوکوں مرتی تھی، عام بادشاہوں کی طرح اُسے مقبرے اور قبریں بنانے کا بڑا شوق تھا۔ اس کا جمالیاتی ذوق اتنا شستہ تھا کہ اپنی سلطنت کی ساڑھے تین سو خوبصورت پری جمال اور آئینہ رو عورتیں اس کے حرم میں رہتی تھیں، جو ایک ایک دو دو بار شاہی خلوت کی آرائش بنیں اور پھر ہمیشہ کے لئے جوانی کی آگ میں جلنے کے لئے چھوڑ دی گئیں۔ پرانے بادشاہوں کی طرح اسے بھی بڑی اچھی اچھی غذائیں کھانے کا بہت شوق تھا، وہ وقت واحد میں ایک سو آدمیوں کا کھانا کھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے ہر کھانے پر ایک سو آدمی مرجاتے تھے۔ اپنے آباؤ اجداد کی طرح اس کو بھی ناچ رنگ اور شراب وکباب کا بہت شوق تھا، کباب تو خیر وہ بہت کم کھاتا — مگر شراب بہت پی جاتا تھا اور اتنی پیتا تھا کہ محل کی ساری عورتوں کے درمیان ننگا ناچا کرتا تھا۔ مگر کسی عورت یا کسی مصاحب یا رعایا میں اتنی مجال نہیں تھی کہ وہ ہنسی تو ہنسی ذرا سی مسکراہٹ بھی اپنے ہونٹوں پر لا سکتی، کیونکہ وہ بادشاہ تھا۔ یعنی ظل اللہ ——— یعنی خدا کا سایہ — یعنی ....؟

بادشاہ اپنی رعایا کی اس وفاداری سے بہت خوش تھا۔ خوش کیسے نہ ہوتا! جب تک رعایا میں گھٹنے ٹیک کر جھک جانے کی عادت تھی اس وقت تک وہ بادشاہ تھا بادشاہ۔

مگر ایک دن گھٹنے ٹیکی ہوئی رعایا میں سے ایک بوڑھا عالم تن کر سیدھا کھڑا ہوگیا اور بولا — "نہیں نہیں ——— میں بادشاہ کے آگے کیوں اپنے گھٹنے ٹیکوں۔ وہ بھی تو میری طرح ایک انسان ہے۔ اس کے بھی میری طرح ہاتھ پاؤں، آنکھ ناک، کان، آنتیں، کہنیاں اور گھٹنے ہیں پھر وہ بادشاہ کیوں اور میں جمال محمد کیوں ہوں ——— میں بادشاہ کو نہیں مانتا"

بادشاہ کے مصاحبوں نے جمال محمد عالم کی یہ بات سنی تو دوڑے دوڑے شاہی محل گئے اور سانس روک کر سر جھکا کر عرض کیا: "جہاں پناہ ——— ! جان کی امان پائیں تو عرض کریں"

بادشاہ نے خاص مبتسم آلود بادشاہی لہجہ میں فرمایا "حکم ہے"

مصاحبوں نے جمال محمد عالم کی ساری باتیں عرض کر دیں۔ بادشاہ کو بہت غصہ آیا۔ غصہ کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ منہ میں سفید سفید کف آگیا۔ تھوڑا سا کف اس کی بڑی بڑی مونچھوں پر بھی لگ گیا اور اس نے جانور کی طرح چنگھاڑ کر حکم دیا "جمال محمد کو فوراً پھانسی دیدو"

جمال محمد کو اسی شام پھانسی دیدی گئی۔ اس کے بعد سے رعایا پر بادشاہ کے غصہ کی ایسی ہیبت طاری ہوگئی کہ رعایا بادشاہ سے، شیطان سے بھی زیادہ ڈرنے لگی۔

پرانے بادشاہوں کی طرح اسے بھی سیر و شکار کا بہت شوق تھا۔ عورتوں اور جانوروں کے شکار میں اس کا ڈنکا

چارہ اگر دام میں بچ رہا تھا۔ شکار کے لئے بادشاہ کو ایسی ایسی مصیبتیں اٹھانی پڑتی تھیں کہ بعض بعض اوقات پورا پورا دن مچان پر بیٹھے بیٹھے اس کو جمائیوں کی ڈاک سی لگ جاتی اور تھک کر چور ہو کر وہ افیون کھاتا اور فارسی غزلیں کہتا۔ شکار کا ہانکا کرنے والے دیہاتی شکار کو اتنی دیر میں ہانک کر لاتے تھے کہ بادشاہ کو اتنا غصہ آجاتا کہ اس کا جی چاہتا کہ شکار کے بجائے اپنے ان دیہاتیوں کو گولی کا نشانہ بنا دے۔ لیکن چونکہ وہ دیہاتی بغیر گولیوں ہی کے مرتے جا رہے تھے اور اس کی رعایا بھی اس لئے بادشاہ اپنے غصے کو دبا لیتا ——— دیہاتی شکار کا ہانکا کر کے شکار کو بالکل اس کے مچان کے قریب لے آتے۔ بلکہ بعض دیہاتی تو شکار کو زخمی بھی کر دیتے تھے تاکہ شکار ادھ موا ہو جائے یا بالکل مر جائے۔ اس کے بعد بادشاہ بندوق اٹھاتا اور مچان میں سے شکار کو مار دیتا۔ شکار اگر ادھ موا ہوتا تو پورا مر جاتا۔ اگر مرا ہوا ہوتا تو دوبارہ مرتا۔

اس کے بعد بادشاہ مچان سے اتر کر نیچے آتا اور شکار کے مردہ جسم پر ایک پاؤں اور بندوق کا کندا ٹیک کر بڑی تمکنت سے کھڑا ہو جاتا ——— شاہی فوٹوگرافر سامنے آکر جھک کر فرشی سلام بجا لاتا اور ایک عدد تصویر کھینچ لیتا۔ پھر وہ تصویر ملک کے اخباروں میں شائع ہوتی اور ساری دنیا میں غوغا مچ جاتا کہ واہ واہ وا ——— بادشاہ کے مشغلۂ شکار پر مشہور درباری ادیب رئیس الادبا آغا میرزا قرمزی نے "تذکرۂ شکار شاہی" کے نام سے ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔ اس تصنیف کے باب ہفتم میں صفحہ ۳۶۲ پر آغا میرزا قرمزی ایک بڑا دلچسپ واقعہ تحریر کرتے ہیں: —

"ایک بار بادشاہ جہاں پناہی سمندو کے جنگلوں میں شکار کے لئے تشریف لے گئے۔ جنگلی ہاتھی کا شکار مقصود تھا۔ بادشاہ سلامت اور بادشاہ سلامت کے منہ چڑھے مصاحب حضرت شیخ معجونی بندوقیں لئے بیرون چڑھے سے مچان پر متمکن جنگلی ہاتھی کا انتظار کھینچ رہے تھے۔ دوسرے سارے مصاحب ان جنگلی ہاتھی کا ہانکا کرنے جنگلوں میں بھٹک رہے تھے۔ ہاتھی جنگل میں گھومنے کے بجائے اپنی نئی نویلی ہتھنی کے ساتھ مچان سے بہت قریب ایک تالاب میں غسل کر رہا تھا۔ بعد غسل کے وہ ہاتھی ذرا سیر و تفریح کے لئے نکلا تو اچانک اس کی نظر مچان پر پڑی جہاں بادشاہ سلامت اور شیخ معجونی اسی کے منتظر بیٹھے تھے۔ ہاتھی کو بڑا غصہ آیا اور وہ اپنی نئی نویلی ہتھنی پر رعب جمانے کی خاطر حضور بندگان عالی کی طرف دوڑا۔ حضور بندگان عالی نے بندوق مبارک اٹھائی اور وہاں سے چلا دی۔ مگر گولی جیسے مکھی کی طرح بھنبھناتی ہوئی ہاتھی کے کان کے قریب سے گزر گئی۔ ہاتھی کو غصہ بھی ہاتھی ہو گیا یعنی بہت بڑھ گیا اور وہ اپنے حلق کی ساری رگیں پھلا کر زور سے چنگھاڑا ——— اور اپنی سونڈ سے مچان پکڑ لی۔ مچان جھولنے لگا۔ اور ٹوٹنے کے قریب تھا ادھر بندگان عالی کی بندوق مبارک خالی تھی۔ شیخ معجونی کی بندوق البتہ بھری ہوئی تھی، مگر شیخ معجونی پوچھ رہے تھے:

جہاں پناہ ——— حکم ہو تو بندوق چلا دوں؟

حضور بندگان عالی ——— جان کی امان پاؤں تو گولی مار دوں؟

حضور بندگان عالی کیا حکم دے سکتے تھے۔ کیونکہ حضور بندگان عالی کی پتلون ——— خیر اسی اثنا میں ہانکا کرنے والے مصاحب دوڑے دوڑے آئے اور برچھیوں اور بندوقوں سے ہاتھی کو مار گرایا۔ اس کے بعد بادشاہ سلامت نے شیخ معجونی کو پھانسی کا حکم دے دیا اور اپنی پتلون دھلوانے کے لئے دریا پر بھیج دی۔

راوی کہتا ہے کہ جب شاہی پلٹون دریا پر ٹہل رہی تھی تو ایک نوجوان طرحدار دھوبن پلٹون کو دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بادشاہ نے اس بدتمیز دھوبن کو بھی پھانسی کے تختہ پر چڑھانے کا حکم عنایت فرمایا۔

اس جنگلی ہاتھی، شیخ سجونی اور طرحدار دھوبن کے شکار کے بعد ریاست کے سارے مشاق سے مشاق شکاریوں نے اپنی اپنی بندوقیں رکھ دیں کہ جب تک بادشاہ سلامت جیسا شکاری موجود ہے ہم میں یہ تاب، یہ سکت، یہ ہمت کہاں ——————؟

بادشاہ سلامت کے شکار کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ عام شکاریوں کی طرح شکاری کتے نہیں پالتے تھے۔ بلکہ شکاری کتوں کا کام وہ اپنے عہدہ داروں سے لیا کرتے تھے، جنھیں حضور نے سارے ملک میں پھیلا رکھا تھا۔ یہ شکاری کتے اصلی شکاری کتوں سے زیادہ خونخوار تھے۔ بڑی بیدردی یعنی بڑی چالاکی سے رعایا کی کمائی اور بہو بیٹیوں کا شکار کرتے تھے۔ غرض کہ بادشاہ کا ملک ملک نہیں تھا بلکہ ایک بہت بڑی شکارگاہ تھا۔ مشہور چینی سفیر فیشن چو دُو چو دُو، اپنے سفرنامے میں تحریر کرتا ہے کہ اس بادشاہ کے زمانہ میں فن شکار کو جتنی ترقی ہوئی کسی زمانہ میں نہیں ہوئی۔ بادشاہ تو اس فن میں ایسا طاق اور مشاق تھا کہ اکثر اوقات وہ بندوق اور دوسرے ہتھیاروں کے بغیر بھی شکار کھیلا کرتا تھا۔ مثلاً ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک گاؤں کے کسانوں نے خشک سالی کی وجہ سے کھیتوں کا لگان دینے سے انکار کر دیا تو بادشاہ کو بہت غصہ آیا یعنی بادشاہ بہت ہنسا۔ یہ بادشاہ کی خاص عادت تھی، جب اسے غصہ آتا تو وہ زور سے ہنستا تھا اور جب اسے ہنسی آتی تھی تو وہ منہ پھلا لیتا ——— آخر کو وہ بادشاہ تھا۔ یعنی ظل اللہ۔ یعنی خدا کا سایہ۔ یعنی ......؟

جب بادشاہ کا غصہ تھما یعنی اس کی ہنسی رکی، تو اس نے حکم دیا کہ ان کسانوں کا سارا اناج ضبط کر لیا جائے۔ بادشاہ کے شکاری کتوں نے یعنی عہدہ داروں نے اپنی اپنی دُم زور سے ہلائی اور پھر سارا اناج اپنی دُم کی جھاڑو سے جھاڑ جھوڑ کر محل مبارک میں پہنچا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس گاؤں کے سارے کسان روٹی روٹی کو ترستے مر گئے جو آدمی کے بچے تھے زیادہ موت کے چنگل سے بچ نہ سکا۔ چھوٹے چھوٹے شیرخوار بچے بلک بلک کر مر گئے۔ نازک نازک عورتیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئیں۔ اس طرح پانچ چھ سو انسان صرف اس لئے مر گئے کہ بادشاہ کو غصہ آ گیا تھا۔ بادشاہ کے اس انوکھے غصہ کی تصویریں جب ملک کے اخباروں میں چھپیں تو چار دانگ عالم پر بادشاہ کی ہیبت طاری ہو گئی۔

بادشاہ سلامت کے شکار کا سب سے زیادہ پُرلطف واقعہ تو وہ ہے ——— وہ آدم خور شیر کے شکار کا واقعہ ——— واقعہ یوں ہے کہ جھنڈور کے جنگلوں میں ایک شیر آدم خور ہو گیا تھا، وہ جنگل کے قریبی گاؤں راجپور کے آدمیوں کو پریشان کرنے لگا تھا اور دس پندرہ آدمی چٹ کر گیا تھا۔

راجپور کے گاؤں کے سب آدمیوں نے چوپال میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا کہ اس شیر کو مار دینا چاہئے۔ یہ کام گاؤں کے پانچ مشاق شکاریوں کے سپرد کر دیا گیا۔ مگر جب یہ پانچوں نوجوان شکاری بندوقیں، برچھے اور تیر کمان لیکر جنگل کی طرف جا رہے تھے تو راستہ میں انھیں سرکاری پیادہ ملا جو شاہی حکم لایا تھا کہ خبردار کوئی اس آدم خور شیر کو نہ مارے ——— بادشاہ سلامت خود اس کا شکار کرنے تشریف لا رہے ہیں۔

سارے گاؤں پر اس خبر وحشت اثر سے دہشت پھیل گئی۔ اور پانچوں شکاری اپنے اپنے گھر لوٹ آئے۔

ایک دن گزر گیا بادشاہ سلامت تشریف نہیں لائے۔ مگر ظل الٰہی نے کھیت پر ہل چلاتے ہوئے ایک کسان کو ہڑپ کر لیا۔

(باقی صفحہ ۱۱۰ پر ملاحظہ فرمائیے)

صدیقہ بیگم

عمل - اور - ردِعمل

شاہینہ کی نظریں بار بار اُدھر ہی پڑ رہی تھیں۔ یہ فضائی آوازیں وہ تو ہرنی کی طرح چونک پڑتی تھی۔ جہاں ذرا آہٹ ہوئی اور اس کے کان کھڑے ہوئے "نہ جانے کون ہے" وہ گھبرا رہی تھی۔ ہرنی جو ٹھہری۔ خوف و ہراس کے ملے جُلے اثرات اس کی آنکھوں کی ـــــــ دراز دل سے جھانک رہے تھے۔ وہ نہ جانے کیوں یہاں چلی آئی۔ بھلا یہ نہر بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے، پانی کا ایک نالہ ہی تو ہے ہلکے ہلکے بہہ رہا ہے ـــــ "ہوں" شاہینہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا اور اس کے ادا کرنے میں وہ یہ بھی بھول گئی کہ کیا سوچ رہی تھی، ہوگی کوئی بات اور بے سمجھے بوجھے اس نے اپنی نظریں چاند پر ڈالدیں جو نہر کے اندر جھول رہا تھا۔ اور وہ اس داغ کو تلاش کرنے لگی جس نے کہتے ہیں کہ چاند کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے اور پھولے پھولے شفق کے گلے جیسے اندھیرے کو سورج کا آخری پیغام سنا رہے تھے۔ شاہینہ نے نہر کی گہرائی میں اپنی نظریں گاڑ دیں وہ نہر جس کے اندر پورا چاند سمایا ہوا معلوم ہو رہا تھا تاروں کی قندیلیں دیوالی کے دیپک کی طرح ایک اک کر کے لو دینے لگیں۔ یہ قندیلیں جو پانی سے بھی تو نہ بجھتی تھیں، اور آہستہ آہستہ اس نے اپنی نظریں نہر کی گہرائی سے آسمان کی بلندی پر اٹھائیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ تارے کہیں پانی میں تو نہیں گر گئے۔ مگر وہ تو سب کے سب آسمان پر بُرطرح ٹکے ہوئے تھے۔

"آپا چلو کتنی دیر ہو گئی" اور اختر نے ایک ڈھیلا پانی کی طرف پھینکا۔ تارے لرز گئے۔ شاہینہ ڈر گئی کہ کہیں بجھ نہ جائیں۔ مگر اس نے دیکھا کہ خاموش پانی حلقے بنانے لگا، خوبصورت گول گول حلقے اور چاند کے ساتھ تارے بھی جھولنے لگے۔ شاہینہ کے جی میں تو آیا کہ وہ پانی میں کود پڑے ان بکھرے ہوئے تاروں کو سمیٹ لائے مگر پھر فوراً اس کو یاد آیا کہ وہ نہ جانے کیا بات سوچتے سوچتے بھول گئی تھی۔ اس نے دماغ پر بہتیرا ہی تو زور ڈالا پر وہ بات نہ یاد آنا تھی نہ یاد آئی۔ "اوئی" اس نے اپنے لانبے لانبے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ جانے بھی دو جب نہیں یاد آتا تو مت آؤ میرا کیا لوگے۔ اسکو اپنے خیال پر ہنسی آئی گویا وہ کوئی آدمی ہی تو ہے جس سے وہ بات کر رہی ہے۔

"آپا ـــ یہ تم کو کیا ہو گیا ہے" اختر نے دوپٹہ کھینچا اور پلّو اس کے سینے سے اتر گیا۔

شاہینہ گھبرا گئی وہ تو خیریت گذری جو وہاں پر کوئی نہ تھا ورنہ اختر میاں کو تو خوب ہی چپت رسید کرتی "بدتمیز کہیں کا خبردار جو ابسے دوپٹہ چھوا" مگر ان سب باتوں کا اُسے خیال بھی تو نہ آیا اور بجائے غصے کے اس نے اختر میاں کو دونوں ہاتھوں سے چمٹا لیا ـــــ مگر اختر میاں اس کے کولھوں تک بھی تو نہ آئے۔

"میرا اچھا بھی ہے ــــ دیکھ کیسے مزے کی چاندنی ہے بس ابھی چلتے ہیں وہ دیکھو چندا ماموں"۔

"آپا چندا ماموں دور کے" اور شاہینہ کا جی الجھنے لگا کہ یہ اختر کا بچہ میری بات تو سنتا ہی نہیں اپنی ہی لگائے رہتا ہے۔ شاہینہ نے اس کا ہاتھ زور سے کھینچا اور پھر وہیں پتھر پر بیٹھ گئی۔ اُدھر یہاں کون بیٹھا ہے اور اس نے دوبارہ اختر کو زور سے چمٹا لیا اختر گھبرا گیا، آپا کے پیار سے بس اللہ بچائے۔ اس بُری طرح بھینچتی ہیں کہ ساری ہڈیاں چور ہو جاتی ہیں۔

"ارے دم گھٹتا ہے آپا" مگر شاہینہ کو آج نہ جانے کیوں اپنے بھیّا کا دم گھوٹنے میں مزا آ رہا تھا۔ اور ہرنی تھوڑی دیر کے لئے اپنے ماحول سے بے خبر ہو گئی۔ پر چاند کی کرنیں گستاخی سے باز بھی نہ آئیں۔ اس کا کشادہ جمپر کھلا ہوا تھا اور اس نے

اپنے جسم پر سرسراہٹ سی محسوس کی۔ پھر اس نے اس طرح آنکھیں جھپکائیں جیسے وہ اپنے کھلے ہوئے گلے کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کتنا کھلا ہے یہ گلا بھی اور چاند کی یہ کرنیں شرم تو نہیں آتی انھیں ——— پھر وہ جھینپ سی گئی اس نے دوپٹہ گلے میں ڈال لیا، اور چاند کی طرف دیکھا گویا اس کی نظریں کہہ رہی تھیں "اب بھی باز نہیں آئے گا شرارت سے" مگر دور بہت دور والا چاند بیچ بیچ گھبرا گیا اور جھپاک سے بادل کے ٹکڑے کے پیچھے چھپ گیا ——— اختر اس کی گرفت سے چھوٹ گیا اور وہ اپنے ہاتھوں میں دوپٹہ تھامے ہوئے تھی ——

"کیوں آپا وہ لڑکے نہیں آئے؟"

"نہیں آئے تو میں کیا کروں۔ جا بلا لا ایسا ہی ہے تو"

اور اختر چپ ہی تو ہو گیا وہ اپنی ہرنی جیسی آپا سے ڈر رہا تھا جس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کی تہوں میں نہ جانے کہاں سے یہ غصہ گھس آیا تھا اب اگر اتنی سی بات اس نے پوچھ بھی لی تو اس کا کیا قصور ہوا آخر وہ لڑکے دو دن سے برابر جو آتے ہیں ان کو ہی آنے سے روک لیتیں تو جانتے آندھی ہو، یا پانی ہو پر ان کا آنا ضرور ہو مگر آج وہ بھی نہیں آئے۔ شاہینہ کے ذہن میں پرسوں والا واقعہ ابھرنے لگا۔ چاند آہستہ آہستہ بادلوں میں سرک رہا تھا۔ اور پھر وہ سب باتیں اس کے دماغ سے ٹکرانے لگیں جو تھوڑی دیر پہلے خدا جانے کیوں دور بہت دور جا چکی تھیں۔ یہ لڑکے کتنے بدتمیز ہوتے ہیں اس کو کیا خبر تھی کہ یہاں پر کوئی اور بھی ہے وہ تو دوڑ دوڑ کر تتلی پکڑ رہی تھی جو اسے ذرا بھی بھنک پڑ جاتی کہ اللہ مارا یہاں کوئی موجود ہے تو وہ ہرگز اس طرح نہ دوڑتی ——— تتلی پکڑنے کے تصور سے وہ جھینپ سی گئی۔ اس نے بھی تو بیوقوفی کی تھی کہیں تتلیاں بھی یوں ہاتھ آتی ہیں ——— کوئی تھکی ماندی تتلی کو پکڑ لے تو پکڑ لے، ورنہ اس طرح تو کسی کے پکڑنے سے کبھی ہاتھ نہ آئیں گی ——— شاہینہ نے فضا میں اپنا ہاتھ چلایا جیسے وہ کوئی کتاب بند کرنا چاہتی ہو۔ کتاب تو بند ہو گئی مگر وہ تتلی کے پیچھے برابر دوڑ رہی تھی۔ اور پھر ایک جھاڑی میں اس کا دوپٹہ الجھ کر رہ گیا پھر بھی وہ بھاگتی ہی چلی گئی اس تتلی کے پیچھے جو نہ جانے کہاں جھاڑیوں میں غائب ہو گئی اور شاہینہ کھڑی دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی ——— آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ۔۔ اور پھر وہ جیسے کسی اجنبی بستی میں کھڑی تھی۔ دو نوجوان وہاں کھڑے اس کے جسم کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ شاہینہ کے دل میں ایک ہلکی سی کسک پیدا ہوئی جیسے وہ ننگی ہی تو کھڑی تھی۔ کپڑے سارے کے سارے اس کے جسم پر کھنچ گئے تھے وہ دونوں اجنبی اس کی نگاہوں میں سمٹ کر رہ گئے۔ اور اس کے پیر زمین میں گڑ ہی تو گئے۔

"تتلی" اس نے کہا۔

اور دوسرے نے اس کا جواب لذت آمیز مسکراہٹ سے دیا: "تتلی" شاہینہ نے دل ہی دل میں کہا ——— بڑا آیا تتلی کہنے والا۔ اس کے جی میں تو آیا کہ اس کا منہ کچل دے کوئی کسی کو اس بری طرح دیکھتا ہے۔ شاہینہ کی نظریں آپ ہی آپ جسم پر پڑیں کتنا کشادہ ہے اس کا گلا ——— اس کا منہ لال انگارا ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا، پائجامہ کا ایک پائنچا اس کے ہاتھ میں تھا جس سے اس کا پاؤں اوپر تک کھلا ہوا تھا ———

"اوئی اللہ اب کیا ہوگا" اور تتلی کہنے والا نوجوان اپنی تیز نظروں ہی سے بولنے لگا ———

"اب کیا ہوتا ہے ہم نے تو دیکھ ہی لیا اور تمھارا گلا تو ابھی تک کھلا ہوا ہے"

شاہینہ بھاگتی ہوئی جھاڑی کے پاس گئی جب کس کر دوپٹہ کھینچا چر سے ایک آواز آئی اور اس نے مڑ کر دیکھا! دوپٹہ پھٹ چکا تھا اور وہ دونوں ہنس رہے تھے ——— ناحق اس نے اتنی جلدی کی ——— بیوقوف کہیں کی دوپٹہ اب تو اتنا بھی نہیں ——— اس نے احتیاطاً اسے اوڑھ لیا ——— زندگی میں شاید پہلا موقع تھا جب وہ اتنے باشعور طریقے سے دوپٹہ

کو اوڑھ رہی تھی۔ ورنہ عام طور پر وہ اُسے محض اپنے اوپر ڈال لیا کرتی تھی ——— ماں کے بگڑنے پر بس آنچل اٹھایا اور اوپر لٹکا لیا مگر آج تو ڈھائی گز کا دوپٹہ چھوٹا ہوتے ہوتے اتنا کم رہ گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ننگی محسوس کر رہی تھی مگر یہی دوپٹہ کبھی اتنا لمبا ہو جاتا ہے کہ دادی، ماں کی باتیں بھی سننی پڑتی ہیں۔

"بے حیا ——— میرے نام کی لاج بھی تو نہیں۔ ارے دوپٹہ تو ٹھیک سے اوڑھ سارے گھر میں جھاڑو دیتا پھرتا ہے"۔ مگر یہ سوچ کر وہ خوش بھی تو ہو جاتی تھی کہ چلو اچھا ہے جو یہ ڈھائی گز کا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے تو وہ ملکہ ہونے لگتی ہے ——— جس کے کپڑے فرش پر لٹکتے پھرتے ہیں۔

"آپا ——— دیکھو وہ کون آیا" اور وہ تتلی کہنے والا نوجوان آہی تو گیا۔ مگر وہ دوسرا مسکرانے والا ——— جو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ خدا جانے کہاں چھپا ہے ——— شاہینہ کی نظریں یونہی چاند پر پڑیں نہ جانے اس کے پاس والا تارا کہاں چلا گیا ——— پاس ہی کہیں ہوگا اور وہ آسمان میں اُسے ڈھونڈنے لگی مگر اس کا کہیں بھی تو پتہ نہیں چلا ——— وہ سوچنے لگی کیا آج چاند اکیلے ہی پہاڑ سی رات گذارے گا۔

اختر نے پانی کی سطح پر ایک اور ڈھیلا مارا اور زور سے ہنسنے لگا

"کیوں بیکار پانی کو چھیڑتا ہے چل بہت دیر ہو گئی"۔

دونوں کے قدم آہستہ آہستہ اُٹھنے لگے ——— نوجوان کی نظریں کبھی پانی کی بے چین لہروں پر پڑتیں اور کبھی ان دو راہیوں پر ——— مگر وہ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ صبح ہو چکی ہے آسمان سے پہرے اٹھائے جا رہے ہیں چاند اپنی جگہ پر ہے تو کیا ہوا دھندلا چکا ہے مگر شعور نے جب اس کی آنکھ کھولی تو چاند وہاں سے کہیں جا چکا تھا۔ اور اس کا لاشعور یہ سوچتا رہ گیا کہ زمین گھومتی ہے یا چاند کبھی کبھی تو چاند بادلوں میں سرکتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور پھر اس نے ایک ڈھیلا اٹھا کر پانی کی سطح پر مارا، اور وہ اپنے دیرینہ اصول کے ماتحت پہلے تو تڑپ گیا مگر پھر فوراً ہی حلقے بنانے لگا اور اس کو خیال آیا کہ اس نے پہلے بھی تو اس طرح ڈھیلا مارا تھا۔ یہ ڈھیلا ساکت لہروں میں کیسی تڑپ پیدا کر دیتا ہے پر اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں جب اُس نے دیکھا کہ وہ پانی حسب معمول ساکن ——— ہو گیا۔

اگلے روز جوابی حملے کے طور پر شاہینہ اپنے ساتھ صفیہ کو بھی لیتی آئی۔ صفیہ کی شوخیاں کبھی کبھی اس کو لڑکیوں کے زمرے سے آگے بڑھانے کے لئے کافی ہوتی تھیں۔ وہ اچھلتی بھی تھی تو اس طرح کہ سارے کا سارا جسم چھاچھ کی طرح اُچھل جاتا ——— ہنستی تھی تو اس طرح جیسے آبشار سے پانی گرتا ہو کالج کی ساری لڑکیاں اس کی انھیں حرکتوں کی وجہ سے چڑھتی تھیں ——— یہ بھی بھلا کوئی بات ہے کہ دن بھر اچھل کود کے سوا دوسرا کوئی کام نہیں مگر شاہینہ بھی ایک ایسی لڑکی تھی جو اس کو "جان دوشیزگی" کہہ کر ان بوچھاروں سے بچا لیتی اور اس طرح پھر صفیہ لڑکیوں کے اس جھرمٹ میں آجاتی ——— وہ بھی انھیں میں سے ایک تھی۔ اچھل کود کی عادت تھی تو کسی کا کیا جاتا ہے ——— سب کی تفریح الگ سے ہو جاتی اس لئے آج شاہینہ اس کو بھی اپنے ساتھ لائی تھی ——— طبیعت بہلے گی ورنہ نہر کے کنارے آخر کوئی کتنی دیر اکیلا بیٹھا رہے یہ اختر جس سے بات بھی تو کرنی نہیں آتی ——— جو آتے ہی "چلو ——— چلو" لگاتا ہے ——— یا پھر خاموش پانی پر ڈھیلے مارتا ہے ——— لیکن یہ صفیہ بھی بھلا اس کے کہنے کی کب تھی آخر صفیہ جو ٹھہری منع کرتے کرتے درخت کی ڈالیوں میں ٹنگ گئی ——— وقت کی بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ چاند کا رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ یہ اندھیرا بھی عجیب ہے جو خود بہتا ہے مگر چاند کے پیالے میں روشنی اور شوخی گھولتا جاتا ہے ——— چاند کی کرنیں نہر میں ایک اور مہتاب بنا چکی تھیں

اور وہ حسبِ معمول چاندنی بکھیر رہا تھا۔ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے اور اس کی کرنیں شاہینہ کے کشادہ گلے پر اپنی کمندیں ڈال رہی تھیں۔ اس نے چاند کی طرف دیکھا اور پھر ایک شعوری حرکت سے دوپٹہ گرا دیا جیسے چاند سے کہہ رہی ہو تو دیکھ لے میرا کیا لے گا" — مگر چاند کو اس کے اس فعل کا ذرا بھی احساس نہ تھا اس نے اُسے دیکھا ہی نہیں — نوجوان آچکا تھا مگر شاہینہ کا دوپٹہ ابھی تک سرکا ہوا تھا۔ وہ چونک پڑی لیکن نوجوان نے بھی چاند کی طرح اس کے ڈھلکے ہوئے دوپٹہ کا خیال بھی نہ کیا۔ بلکہ اس کی نظریں جھولتی ہوئی صفیہ پر پڑیں اور وہیں گڑ کر رہ گئیں مگر وہ جھولے جا رہی تھی جیسے آج ہی تو اُسے کھیلنے کا موقع ملا ہے۔

"صفیہ دیکھو وہ آگیا ادھر آجاؤ" اس نے آہستہ سے کہا۔

"آنے دو میرا کیا کرلے گا — تمہیں اپنا دوپٹہ سنبھالو" شاہینہ جھینپ سی گئی اور آہستہ سے اس نے آنچل سر پر ڈال لیا — سچ کہتی ہیں یہ لڑکیاں — بھلا یہ بھی کوئی شرارت ہے اجنبیوں کے سامنے ایسی بے باکی سے جھولنا — آخر وہ کیا کہے گا — اس نے نوجوان کی طرف غور سے دیکھا مگر اس کی نظروں کو اپنی طرف نہ موڑ سکی وہ کس بری طرح صفیہ پر نظریں گاڑے ہوئے تھا اور شاہینہ کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ بالکل ننگی کھڑی تھی۔ کپڑے سارے کے سارے اس کے بدن سے گر گئے تھے مگر صفیہ اور تیزی سے جھول رہی تھی۔ یہ نظریں بھی تو اس کے جسم کو نہ سمیٹ سکیں —

"یہ لڑکا بھی تو کیا ڈھیٹ ہے" وہ آگے کچھ نہ سوچ سکی اس کا دوپٹہ بھی سر سے ڈھلک گیا مگر وہ تو ابھی تک صفیہ ہی کو گھور رہا تھا۔ شاہینہ کے سامنے گویا آئینہ رکھا ہوا تھا۔ چہرہ پر جھریاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اور بال سفید ہو گئے تھے، منھ لال انگارا ہو گیا تھا۔ صفیہ تتلی کو دیکھتے ہی شاخ چھوڑ کر اس کی طرف دوڑی — اور بات کی بات میں چوکڑی بھرنے لگی۔ نوجوان کی نگاہیں بھی صفیہ کا اسی طرح تعاقب کر رہی تھیں۔ شاہینہ کا دوپٹہ سرکا ہوا تھا۔ اور اس کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی ہوگی۔ چاند کی کرنیں اس کے جسم میں گھسی جا رہی تھیں۔ اور وہ گدگدی محسوس کرنے لگی۔ مگر وہ ہر چیز سے بے خبر صفیہ کو گھور رہا تھا۔ شاہینہ کا غصہ بڑھنے لگا "کیسی مصیبت لے آئی"

مگر وہ تتلی پکڑنے میں مشغول تھی۔ بیوقوف لڑکی کہیں تتلیاں بھی کسی کے ہاتھ آتی ہیں۔ جب آنا ہوتا ہے تو خود ہی آجاتی ہیں۔ پکڑنے سے تو کبھی بھی نہیں آئیں گی۔ شاہینہ کو یاد آیا کہ وہ تتلی کہنے والا لڑکا نہیں آیا۔ دور دور سے کہیں پتہ نہیں خدا جانے کیا بات ہے کاش وہ آج آجاتا — حد ہو گئی بیباکی کی — جوان لڑکی کو کوئی اس طرح گھورتا ہے — اس نے غلطی کی جو صفیہ کو ساتھ لائی اس سے تو اکیلی ہی بھلی تھی یہ سب خیالات اس کے دماغ میں پلٹے کھا رہے تھے۔

"اختر بھیا — یہاں تو آنا" وہ اختر کا انتظار کئے بغیر اس کے قریب چلی گئی۔

"میرا بھیا بھی ہے" اس نے اختر کو پھر کل کی طرح چمٹا لیا

"دم گھٹتا ہے آپا، تم کو کیا ہو گیا ہے؟"

"ہٹ پرے کو — بھلا دم گھٹنے کی بات ہے ایک تو پیار کرو" اس نے نوجوان کی طرف دیکھا جواب بھی وہیں کھڑا ہوا تھا اور صفیہ دور کھڑی ہوئی اس کو چڑا رہی تھی۔

"بے حیا کہیں — دا بھئی اس کے نام کی شرم بھی تو نہیں — اور اس کے قدم تیزی سے صفیہ کی طرف بڑھنے لگے

"چل بھیا چلیں کتنی دیر ہو گئی" اس نے جھٹکے سے دوپٹہ اپنے کاندھے پر ڈال لیا اور گھور کر نوجوان کی طرف دیکھا گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی تھی۔

"جاؤ مجھے مت دیکھو میں بدصورت ہی سہی" اس نے دوپٹہ کاندھے پر ڈال تو لیا تھا مگر پھر بھی اُسے تسکین نہ ہوئی

اس نے اور بھی اچھی طرح اوڑھ لیا اور لپٹ لپٹا کر صفیہ کی طرف چل دی آج اگر کہیں دادی اماں ہوتیں تو خوش ہو جاتیں۔

"بڑی حیادار ہے میری بیٹی —— لاکھوں میں ایک دیکھو کس سلیقے سے آنچل ڈالتی ہے۔"

شاہینہ کی نظروں میں دو شیزہ نظریں نہ جانے کہاں سے سمٹ آئی تھیں۔

"چلو چلیں" صفیہ نے کہا —— اور تینوں کے قدم آہستہ آہستہ اُٹھنے لگے، آج اختر نے پانی پر ڈھیلا بھی تو نہیں مارا وہ بھی خاموشی سے چلا جا رہا تھا۔ راستے بھر اس نے سکوت کو نہ توڑا حالانکہ دونوں کے دلوں میں خیالات کا سمندر ٹھاٹیں مار رہا تھا۔

آج تیسرا دن تھا۔ شام اپنا ڈیرا لئے چلی جا رہی تھی تارے بھی ہلکے ہلکے ٹمٹما رہے تھے گویا دن کے دیوتا کو سلامی دے رہے تھے وہ مطمئن تھے اچھا ہے وقت کا بہترین حصہ بھی یہی ہے چاہو جتنا وقت بھی مل جائے۔ ورنہ پھر چاند نکلے گا تو انھیں اپنے چراغوں کی لو مدھم کرنی پڑے گی۔ نہ جانے کب چاند نکل آئے۔ وہ بھی ہلکے ہلکے نہریں جھولنے لگے۔ جیسے آئینہ دیکھ رہے ہوں سامنے والا درخت چپ چاپ کھڑا تھا کوئی اس پر لٹک کر جھولنے والا نہ تھا، شاہینہ اور اختر کو دیکھ کر وہ بھی جھومنے لگا مگر شاہینہ نے ایک نظر ڈالنے کے بعد پھر اس پر سے اپنی نظریں ہٹالیں اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ درخت بھی اس سے سوال پوچھ رہا تھا۔

"میری صفیہ کو کہاں چھوڑ آئیں" —— مگر درخت تو درخت نہر کا پانی بھی اس سے اُچھل اُچھل کر یہی پوچھ رہا تھا، سامنے سے اُڑنے والی تتلی بھی اس سے یہی سوال پوچھ رہی تھی۔ شاہینہ اس پورے ماحول سے اُلجھ رہی تھی۔

"آپا —— وہ لڑکا نہیں آیا" اختر سے نہیں رہا گیا

"نہیں آیا تو میں کیا کروں ——" اختر چپ ہو گیا اس کے دماغ میں پہلے دن کا جواب گونجا۔

"جا بلا لا —— جا" مگر اس نے ایک ڈھیلا اٹھایا اور نہر کے پانی پر پھینک دیا۔ نہر میں حلقے بننے لگیں اور وہ بھول گیا کہ اس کی آپا نے آج کیا جواب دیا۔ اندھیرا ہوتا جا رہا تھا کیونکہ آج چاند نے بھی طے کر لیا تھا کہ وہ نہ نکلے گا۔ یہ تارے کہاں تک ناگن جیسے اندھیرے کا مقابلہ کریں گے۔ جو بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

نوجوان آ گیا۔

چاند بھی جیسے زمین کی آغوش سے اُچھل کر آسمان پر لٹک گیا۔ شاہینہ نے پہلے چاند کی طرف، پھر نوجوان پر نظریں ڈالیں اور پھر وہ نظریں آہستہ آہستہ بیباک ہوتی جا رہی تھیں۔ شاہینہ نے دل ہی دل میں کہا ——

"صفیہ کو دیکھا کرو —— اب جو کبھی اس کو یہاں لاؤں۔ بڑے آئے اس کو گھورنے والے۔ —— وہ ٹہلتے ٹہلتے نہر کے بالکل پاس پہنچ گئی۔ نہر کے پانی پر اس نے چاند کی کرنوں کی طرح اپنی نظریں ڈالدیں۔ بالوں کی ایک لٹ اس کے منھ پر آ پڑی —— اس نے چونک کر نوجوان کی طرف دیکھا —— آج وہ ساری پہن کر آئی تھی۔ اور ساری کے پلو سے اس نے اپنا سر اچھی طرح ڈھک لیا۔

نوجوان ایک تتلی کی طرف دوڑا۔ شاہینہ کا تنفس تیز ہو گیا۔

"چل بھیا چلیں —— بہت دیر ہو گئی"

"نہیں آپا ابھی تو آئے ہی تھے"

"نہیں تجھے کام ہے" اس کے قدم اٹھ رہے تھے۔ اور وہ نوجوان تتلی کی طرف دوڑ رہا تھا ——

انور عظیم

تاریکیاں!

جادا کی پیشانی پر پسینہ کی موجیں چیونٹیوں کی طرح چلبلانے لگیں، اس نے اپنی انگلی کو درانتی کی طرح موڑتے ہوئے پسینے کی موجوں کو سمیٹ کر زمین پر گرا دیا۔ اس کے بالائی لب پر چند شبنمی دانے چمک رہے تھے، اس کے ہونٹوں کے آخری کونے کپکپا رہے تھے اور ٹھوڑی کے خمیدہ ابھار پر ایک تل بھی پسینے میں ڈوبنے لگا تھا۔ کتنی کڑی دھوپ تھی۔ معلوم ہوتا تھا مدِ نظر تک طلائی چادر پھیلی ہوئی ہے، جو ہوا کی طرح تاریک تھی اور چولھے کی آنچ کی طرح گرم، — ایک اضطراب، کسک اور بےچینی۔

وہ دیر تک اداس اور ویران چولھے کو تکتی رہی، جس کے روندے ہوئے چہرے ہی سے ظاہر تھا کہ کئی وقت سے اس میں آگ نہیں جلائی گئی ہے اور وہ ایک دوزخ کی طرح تھا جس کے پیٹ سے آگ کھینچ لی گئی ہو خالی خالی، ٹھنڈا اور بےحس۔ اس کی آنکھیں بھی اس پر منڈلا رہی تھیں۔ مگر ان میں بھی ایک بےمعنی خلا تھا۔ اس کے اندر کوئی روشنی نہیں تھی اور تھی تو بہت مدھم۔ لیمپ کی چمنی کی طرح جو دھوئیں سے بھر کر دھندلی ہو گئی ہو۔ اس میں شمسان کا سنسان، ڈراؤنا اندھیرا چھایا ہوا تھا اور جیسے اندر ہی اندر راکھ کے بگولے ناچ ناچ کر تھک گئے ہوں، اب بالکل سناٹا تھا، کھوکھلا پن اور سپاٹ — اس چولھے کی طرح جو کسی فاقہ زدہ مردہ کسان کی طرح منھ پھاڑے ہوئے تھا اور جس کے پیٹ میں راکھ بھی نہ تھی اور جس کی پیشانی پر دھوئیں نے جوتے کے تلوے کی شکل بنا دی تھی، اور جو اوپر سے نیچے لٹک رہا تھا۔

اُس روز گاؤں میں کافی چہل پہل تھی۔ ہر طرف زندگی لہریں مار رہی تھی۔ برگد کے سائے تلے چند لڑکے ریوڑوں کے غول میں بیٹھے تھے۔ کھیت بالکل سوکھے ہوئے تھے جلی ہوئی انگیٹھی طرح۔ لیکن لیکن کہیں کہیں تو زمین پھٹ بھی گئی تھی اور کوڑھ کے زخم کی طرح درمیان سے درازیں پڑ گئی تھیں۔ بکریاں اور گائیں چار زانو ہو کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بکریوں کے ننھے ننھے بچے کلیل کر رہے تھے۔ کبھی اُچک کر، گردن ایک طرف جھکا کر اور کانوں کو سمیٹ کر وہ برگد کے موٹے تنے پر چڑھ جاتے اور کچھ اس شان اور دھڑلے سے اس پر دوڑ کر گائے کے گھیرے میں گھس جاتے جیسے بہت نڈر اور دلیر ہوں۔ لڑکے سب لنگوٹی باندھے گائے کی پیٹھ پر اڑے ہوئے تھے۔ ایک سیاہ فام لڑکے نے دونوں رانوں کے نیچے اپنی لاٹھی دبا رکھی تھی جو تیل اور دھوئیں کے امتزاج سے چکنی اور سرخ ہو گئی تھی۔ اس کے دانت نکلے پڑ رہے تھے۔

جادا دیر تک انھیں گھورتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کرنا چاہتی ہے پر نہیں کر سکتی۔ سکوت کو متلاطم کرنا چاہتی ہے مگر ہاتھ پاؤں جواب دینے لگتے ہیں۔ بےبسی اور جبر کا اظہار اس کی خاموش تنہائی میں مدغم تھا کھیت سے بچوں کے بھنبھنانے کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ انھیں گرمی لگتی ہی نہیں تھی۔ درختوں کے ملیو تر سے سایوں میں وہ مگن رہتے۔ اس کی ساری چھدری چھدری ہو گئی تھی اور اس کا سرخ کنارہ ٹوٹتے ٹوٹتے اب سرخی اور سفیدی دونوں کے بیچ میں ایک فریب کی لکیر بن گیا تھا۔ ایک دھندلکا، مٹا مٹا سا۔ پسینے سے اس کا چہرہ، بلکہ

سارا جسم شہ ابور تھا۔ اسی لئے اس کی چھاتیاں آنچل کو بھگو کر اپنی نمائندگی کا علم اٹھائے ہوئے تھیں۔ ساری میں اب کپڑا رہا نہیں تھا۔ ساری تو ایک خیال، ایک نحیف تصور میں ڈھل چکی تھی، اس سے بھی کتر گئی گذری ایک ذرا مٹھی میں مل دو اور راکھ ہو کر رہ جائے۔ اس کی آنکھیں تھکی ہوئی تھیں، جیسے بہت لمبا سفر طے کر کے آئی ہوں اور اب بھی منزل نگاہوں سے اوجھل ہو۔ اس کی آنکھوں نے، اس کی روح نے، اس کے جسم نے سچ مچ ایک بہت ہی لمبا سفر طے کیا تھا، — ایک ایسا سفر جو ادھورا رہ گیا تھا اور اس کی انتہا اب بھی نامعلوم تھی۔ وہ ان ہی تھکی آنکھوں سے پھیلی ہوئی دھوپ کی سیاہ چاندنی کو بے تکان دیکھے جا رہی تھی۔ اسے نیند آنے والی تھی، آنکھیں بند ہونے لگیں تھیں کہ روپا آ دھمکی۔

"کیوں جاوا کس سوچ میں ہے تو ———"

وہ سمٹ کر بیٹھ گئی اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے زیادہ بولنے کی قوت نہیں رکھتی۔

روپا ٹھونس کر وہیں بیٹھ گئی — وہ اس کی آنکھوں کو گھورتی رہی۔ وہ کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں اس بچے کی انگلیاں تھیں جو اندھیرے میں نیند سے چونک کر باپ کی چھاتی پر ماں کا گلگلا دودھ ٹٹولنے لگتی ہیں۔ روپا کے چہرے پر ایسی سنجیدگی بہت کم طاری ہوتی تھی، وہ تو ایک پھلاوا تھی، ایک الاپ، ایک قہقہہ، بلند ہوتا ہوا، دستوں میں چنگھاڑتا ہوا، اور اس کی مسکراہٹیں تو ریگزار میں گل بوٹے کھلاتی تھیں، اس کے جسم کی پھڑکن اور چلبلاہٹ مشہور تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کا بس چلے تو راہ چلتے بھینسوں کی طرح کھردرے درختوں سے اپنا جسم رگڑتی چلے۔ جانے اندر ہی اندر اسے کھجلی ہوتی رہتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس کے بارے میں بہت سی روایتیں مشہور تھیں۔ طرح طرح کے قصے عورتوں کے ہونٹوں پر چہل قدمی کرتے رہتے۔ مگر اسے ان چیزوں کی پرواہ ہی کب تھی۔ وہ تو ایک مستقل مزاج چٹان تھی۔ نہ اس نے اپنے جسم کو تڑپا کر جلنا چھوڑا۔ نہ اس نے قہقہوں پر پہرہ بٹھایا اور نہ مسکراہٹوں کو افیون چٹائی۔ وہ اس ندی کی طرح بڑھتی رہی جو نہ کسی کے ڈوبنے کا لحاظ کرتی ہے۔ نہ ابھرنے کی فکر۔ وہ بس بہتی رہتی ہے، بس چلے تو تیرنے والے پار کر جائیں، نہیں تو ڈوب جائیں، محبتوں میں ناکام ہو کر خودکشی کر لیں یا زمیندار کی مرغیاں، کدو اور لہسن ڈھوتے ڈھوتے غرق ہو جائیں۔ ندی کا جو اصول ہے وہی اصول روپا کا تھا۔ اور وہ ندی کی طرح بدنام تھی۔

"یہ ندی بڑی لالچی ہے چٹوری ہے ——— خونی ہے، بلیدان لیتی ہے، جوانوں کی دشمن ہے" اور جاوا کی طرف نظر رجوع ہوا تو ——— "اس کے دیدے کا پانی تو جیٹھ کی زمین میں سوکھ گیا۔ بدن نہیں ہے الجھا ہے، ایک سو پیاس ہی نہیں بجھتی ——— " اور پھر ایقان کی منزل طے کرانے کے لئے ——— "وہ کھیت میں اس کے پاس پائی گئی اور تالاب کے کنارے چاندنی رات میں فلاں نے اس کو فلاں کے ساتھ دیکھا تھا اور فلاں سے فلاں نے کہا تھا، اور فلاں سے فلاں نے سنا اور پھر فلاں نے فلاں کے سامنے مجھ سے کہا ——— یہ کوئی جھوٹ تھوڑا ہی ہے۔ ہاں" ہر شخص اس کے بارے میں اسی قسم کی باتیں کرتا۔ روپا کی بدتمیزیوں کے تذکرے میں چھوٹے بڑے سب دلچسپی لیتے تھے۔ انھیں بڑا مزہ ملتا تھا۔ لیکن وہ اٹل چٹان تھی۔ وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ اس نے ریوڑوں کو چرانے والے لڑکوں سے ہنس ہنس کر، ان کی چٹیا مروڑ مروڑ کر بولنا نہ چھوڑا۔ اور۔ اس نے تالاب کا نہانا چھوڑا۔ اور نہ یہ کہ ——— نہاتے نہاتے وہ بالکل ننگی ہو جاتی، اپنی ساری کو مٹی سے مل مل کر دھوتی، اور جب تک وہ سوکھ نہ جاتی وہ گھڑیالوں کی طرح نتھنے پھلاتی ہوئی اپنا سارا جسم پانی میں گاڑے رہتی اور نہ اس نے کسی سے کہا کہ اس کے باپ کے بیل اور بھینس زمیندار کی کچہری والوں نے ضبط کر لئے ہیں اور زمینیں چھین لی ہیں۔

قصور یہی بتایا جاتا ہے کہ اس نے ایک روز حویلی میں آنگن کو گوبر سے لیپنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن وہ کس کس کو بتاتی چلتی کہ اس کے پاس ایک ہی ساری تھی۔ اس کے گھر میں آنسوؤں اور غموں کا دھواں گھٹ رہا تھا اور اس کی شادی نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے کہ دور تک یہ بات پھیل گئی تھی کہ رام ناتھ زمیندار نے اسے ایک روز اپنے کمرے میں دو گھنٹے تک بند رکھا تھا۔ ——— وہ صرف قہقہہ لگاتا جاتی تھی، ہنسی اور کھلواڑ ——— !

دونوں ایک دوسرے کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ روپا کے ہاتھ جادا کے جسم اور روح کو ٹٹول رہے تھے۔ جادا اس کے جسم کے اندر جھانک کر اس کی روح کو گھور رہی تھی جو گاؤں کے خیال میں ایک گھاؤ میں تحلیل ہو چکی تھی۔ جس میں صرف تاریکیاں تھیں، اور جس میں پاپ کا زہریلا سمندر بند تھا، اور جس میں تعفن کا جھاگ اینڈ رہا تھا۔

"تم چپ ہی رہو گی کیا ——— ؟"

پھر بھی جادا چپ ہی رہی۔ وہ بولنا چاہتی تھی مگر کوئی چیز اس کے حلق میں اٹک گئی تھی اور اس میں جیسے اس کی طاقت ہی نہیں تھی کہ اپنے حلق کو صاف کرے، کچھ بولے اور اپنی زندگی کا ثبوت دے۔ روپا اپنے ناخن کے کنارے دانتوں سے کھٹکنے لگی۔ جادا اپنے گھر کے منہدم حصے کو تکنے لگی۔ اس کی آنکھیں اب بدل رہی تھیں، اس کی نگاہوں کا خلا جیسے مٹنے لگا تھا اور ان میں ایک جوت جلنے لگی تھی۔ امید کی جوت یا ضد کی جوت یہ کہنا تو مشکل ہی تھا۔ جس طرف وہ دیکھ رہی تھی دیوار گری ہوئی تھی۔ جس کے درمیان سے پہاڑی کا وسیع دیو سا لال سرمئی جسم نظر آ رہا تھا۔ درختوں کے انسان نما ہیولے جھوم رہے تھے۔ کھپرے کا چھپر جھک گیا تھا اور وہ حصہ بیچ سے ترازو کا ایک پلڑا دکھائی دے رہا تھا جو بار کی زیادتی سے نیچے لٹک گیا تھا۔ اس کی سانسیں تیز ہونے لگیں اور چہرے پر جو یاس اور بے چینی کی لکیریں رقصاں تھیں، سمٹنے لگیں۔

"تو جلدی میں ——— یہ بھی گم سم اچھا ہے، ——— ہوں" وہ اٹھنے لگی

"کدھر کدھر، ——— روپا ——— بیٹھ تو ذرا ———"

"بیٹھوں کیا تیرا سر ———" وہ غصہ ہونے لگی

"آج تو گاؤں میں بہت چہل پہل ہے نا ——— زمیندار نے بڑی تیاری کروائی ہے"

"اور کیا ——— دیکھو نا کتنے بھانت بھانت کے باجے منگوائے ہیں ——— اور لونڈے بھی آئے ہیں، ہاں ہاں انھیں لوگ لونڈا ہی کہتے ہیں، ہنستی کیا ہو، نہ گال پہ داڑھی، نہ مونچھیں، اور ہیں بھی بالکل بچے، مسیں بھی نہیں بھیگیں، سنا ہے گاتے ہیں تو سانپ پھن پھیلا کر جھومنے لگتے ہیں، ناٹک ہو گا۔ کہتے ہیں گاؤں میں پہلے کبھی اتنی دھوم نہیں مچی۔

"اچھا تو کتھا اور بھگتی چھوڑ ناٹک ہو گا اب ——— باپ مرا ہے رنگ رلیاں منیں گی۔ رام ناتھ کا پوت رہا ہے!"

"اور بڑا سا شامیانہ ٹنگا ہے، پھول پتی سے جڑا ہوا، چاندنی رات کا آکاش، کاغذ کی لال پیلی جھنڈیاں لگی ہیں۔ ہیں ایک طرف دیوی بھی ہو گی، پوجا بھی ہو گی، پھر ناٹک ہو گا، لڑکے کہتے تھے وہ مٹک مٹک کر چلتے ہیں کہ عورتیں بھی مات کھا جائیں ——— ہی ہی ہی ——— میں نے بھی دور سے ذرا دیکھا، پان کچر رہے تھے، بکری کی طرح۔ آنکھوں میں کاجل لگا رکھی تھی اور ہنستے تھے تو ہنسی نہ معلوم ہوتی تھی، اس میں بھی نقل ہی تھی۔ اور کمر ——— ہی ہی ہی، کیا بتاؤں اور وہ جادا پر جھک پڑی اور کان سے منہ کو سٹا لیا، انھیں یقین تھا کہ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں، اور پھر دونوں ہنس پڑیں" ہی ہی ہی ہیہو، ہیہو" ——— "چل تو تو بکتی ہے" جادا نے اسے پرے ڈھکیل دیا۔ اس کے گالوں پر ہلکا سا رنگ چھا گیا۔

"پگلی میں کوئی جھوٹ کہتی ہوں ——— آ چل، دیکھ لے چل چل چل ———" اور کلائی پکڑ کر اس کو کھینچنے لگی۔ "چھوڑ بھی، ———" اس نے اپنی ساری کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ اسے خطرہ تھا کہیں ساری

دانے دارچینی کی طرح بکھر نہ جائے۔ اس میں دم ہی کیا تھا، پُرانی ایک سال کی بُڑھیا ساری۔ کپڑا تھا، لوہا تو تھا نہیں۔ اور جب وہ کھڑی ہوئی تو اس کا جسم ساری کے اندر ہوتے ہوئے بھی اپنا بھرم کھو رہا تھا۔ لیکن وہ کیا کرتی، سورج بہت جھک گیا تھا۔ اتنا کہ پیپل کے درختوں کی آڑ میں ہوگیا تھا، اور سائے پورب کا افق چھونے کے لئے تیزی سے رینگ رہے تھے۔ چاروں ہاتھ پاؤں سے، —— بے آواز، غیر محسوس اور بے خرام۔ اس نے ایک بار اور روپا کو ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ روپا کا بھوت تھا، چڑھا تو اتر نہیں سکتا۔ اس کی ضد پورب سے نکلے ہوئے سورج کی طرح پچھم میں پہونچ کر ہی دم لیتی تھی۔ آئی کوئی بات تو اب ہوگئی۔

"مگر وہاں دیکھنے کو کیا پڑا ہے روپا۔ کون سے ہاتھی گھوڑے ہیں —"

"اہہ —— بس ہاتھی گھوڑے ہوتے ہیں دیکھنے کے، اور وہ جو کمر والی بات ——" اور دونوں ہنس پڑیں۔

"تو تو بکتی ہے"

"تو تو پگلی ہے"

دونوں دھوپ سے بچتی ہوئی سائے میں چل رہی تھیں۔ رد ہن تپ رہا تھا۔ اس لئے فضا میں جلن بہت زیادہ تھی۔ روپا نے جادا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دونوں کی ساریاں ہوا کے دانتوں سے الجھ رہی تھیں۔ جادا کا مکان گاؤں سے ذرا ہٹ کر تھا۔ بلکہ بیچ میں زمین کا ایک چوڑا قطعہ تھا۔ دھان کے دنوں میں اس میں موریاں لگتی تھیں۔ گیت گائے جاتے تھے، ساون اور بھادوں کی غیر محدود طاقت کے اعتراف میں۔ میگھ، دیوتا کی خوشامد میں، ثنا خوانی ہوتی۔ کسان عورتیں کیچڑ میں لت پت ہو جاتیں، پانی میں گھٹنوں تک ڈوبی —— رہتیں اور جب ان کا راگ بھیگی ہوئی ہواؤں کا کلیجہ چیر کر آسمان کی طرف جھپٹنے لگتا درخت سناٹے میں آجاتے۔ پانی میں بینگ اور جھینگر ٹرانا بند کر دیتے۔ اس وقت کسان عورتیں زمین پر جھک جاتیں۔ ان کی محویت اپنے عروج پر پہنچ جاتی اور ان کے ہاتھ موریوں کو روپتے رہتے۔ جیسے سارس اپنی لمبی گردن اور چونچ سے مچھلیاں چن رہے ہوں —— جادا کے گھر سے ایسا معلوم ہوتا جیسے بہت سارے گدھ کھیت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مُردار کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں —— اور جب شام کے جھٹپٹے میں وہ تھکی تھکی کھڑی، ایک دوسرے کو تکتیں، کیچڑ پھینکتیں اور پانی چھینٹتیں ——، تو معلوم ہوتا کہ گدھ اڑ کر بھاگ گئے ہیں اور مُردے بدن جھاڑ کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ اور اس آدم خور نوچ کو ڈھونڈ رہے ہیں، جس نے چونچ مار کر ان کے بدن کا گوشت نوچ لیا ہے اور ان کی ہڈیوں پر میس اور سوزش کی خراشیں کھینچ دی ہیں۔ تاریکی کے پھیلتے ہوئے آنچل پر صرف انتقامی جذبے کا رنگ چڑھتا ہوا معلوم ہوتا۔ گدھوں کے خلاف جھینگروں اور مینڈکوں کے خلاف، —— گدھ جنھوں نے گوشت نوچا تھا، جھینگر اور بینگ جنھوں نے گدھوں کی فتح پر طربیہ نغمے گائے تھے —— اور پھر اس منظر کا نقطہ بن جاتا، —— گدھ اور صرف گدھ، —— گاؤں کا زمیندار ——

وہ دونوں گاؤں کے قریب ہو چکی تھیں۔

"دیکھتی ہے جادا —— دیکھ کیا آن بان ہے۔ اس سے پہلے بوڑھے زمیندار نے سب کچھ کیا تھا، مگر یہ رنگ یہ تماشہ تو نہ ہوا تھا، اور جانے رات کو کیا کیا ہو، ——" اور جیسے کچھ یاد کر کے ایک سہمی ہوئی ہنسی اس کے ہونٹوں سے ابھری اور گالوں کی گہرائی میں دفن ہوگئی۔ جادا بالکل چپ تھی۔ وہ اس رنگین شامیانے کی طرح تھی جس میں رنگ رنگ کے کاغذی گلدستوں، زنجیروں اور جھالروں کا ایک ہجوم لگا ہوا تھا۔ سبز، گلابی، عنابی، زرد —— اور کون رنگ چھوڑا گیا تھا۔ بہترین سجاوٹ تھی۔ روپا نے اس کا ہاتھ دبایا۔

"وہ دیکھو ادھر چبوترے پر —— وہ پتلی کمر والے، نچے بیٹھے ہیں، کھلکھلا رہے ہیں، کھلاڑی کہیں کے ——

دیکھا وہ ـــــ وہ، ’’ادھر‘‘ اس نے آخر انگلی اٹھا دی۔

’’ہاں دیکھ رہی ہوں‘ ـــــ ارے یہ مرد ہیں یا لڑکیاں ـــــ‘‘ جادا کی زبان سے بے تحاشہ نکلا۔

وہ حویلی کے پاس پہونچ گئی تھیں۔ شامیانے میں ابھی سے لڑکوں کی بھیڑ تھی۔ اچھے لوگوں کے بچے سفید پوش تھے، اور گنواروں کے عریاں، نیم عریاں‘ ـــــ اپنے جسم کے ایک ایک حصے کا اشتہار بانٹنے والے‘ ـــــ جس کے پیچھے ایک تاریک افلاس کا بھوت جبڑے چیر کر ہنس رہا تھا، ـــــ وہ ننگے تھے اس لئے شامیانے سے باہر ہی کھڑے ذوقِ نظارہ کو تسکین پہونچا رہے تھے ـــــ اونچے ناٹک کے چھوکروں کے چاروں طرف بھیڑ لگائے ہوئے تھے، جیسے وہاں پر بندر نچایا جا رہا ہو اور وہ ناٹک والے چھوکرے پوری انفرادیت کے ساتھ مسکرا رہے تھے، جیسے ان میں حیا ہی نہیں۔ وہ آپس میں چشمکیں بھی کرتے مسکراتے، گردنیں ہلاتے، پھر انگلیوں کی ایک لرزش پیدا کرنے اور لچک کر آپس میں کچھ ایسی باتیں کرتے جس کے اختتام پر ایک نسوانی قہقہہ بلند ہوتا، ـــــ اور پھر دبی، دبی چپی چپی، گول مول سی مسکراہٹ بے معنی، بے رنگ اور بے حس۔

’’دیکھا، ـــــ دیکھا، ان حرامیوں کو، کیسے گھور رہے ہیں۔ بھوکے کہیں کے، جیسے ماں کو تک رہے ہوں، دودھ کے لئے، ـــــ بھگوان بچائیں، ـــــ اُف‘‘ وہ دانت پیس کر بولی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر حویلی میں گھس پڑی۔

اندر بھی زندگی اسی طرح بھنبھنا رہی تھی۔ جیسے بھڑوں کے چھتے پر ڈھیلا مار دیا گیا ہو اور وہ اڑتی پھر رہی ہوں، بھنبھوڑ رہی ہوں۔ بوڑھی مالکن کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے مصری کی ڈلیاں تھیں۔ سونف اور الایچی‘ ـــــ وہ شربت کا سامان تیار کر رہی تھی۔ نئی مالکن بڑی بھڑکیلی ساڑھی پہنے ہوئی تھی۔ ہونٹوں سے بہہ کر پان کا رس خارجی حصے کو تر کر رہا تھا۔ جیسے سمندر کے کنارے موجوں کی جھپیٹ سے بالو کا دامن نم ہو جاتا ہے۔ وہ مسکرا نہیں رہی تھی۔ مگر معلوم ہوتا تھا بس مسکرائے جا رہی ہے۔ اس پر کام کتنا تھا۔ اتنے بڑے کاج کی ذمہ داری اس پر کم تھی کیا۔ اس نے روپا اور جادا کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی سٹیڈ دکس کے مقابلے میں لرزتے ہوئے چراغ کو دیکھتا ہے۔ جادا بھی لرز گئی۔ دونوں کو اس بے رخی نے زخمی کر دیا۔ روپا نے بوڑھی مالکن کی طرف دیکھا۔ اسی طرح جیسے ایک کسان زمیندار کا پہلا طمانچہ کھا کر کسی خزاں رسیدہ درخت کو پناہ لینے کے لئے تکنے لگتا ہے۔ وہ لوگ نادم نادم، بجھی بجھی بوڑھی مالکن کے پاس بیٹھ گئیں۔ گھر میں عورتیں بچے دوڑ رہے تھے۔ کوئی ایک چیز لے جا رہا تھا، کوئی دوسری، بھاگم بھاگ‘ ـــــ گاڑی چھوٹی جا رہی ہے، آگ لگ گئی ہے، ـــــ بوڑھی مالکن نے ہنس کر کہا۔

’’تم ہو تم ـــــ اوہ، مرے بچے کو پوجا پاٹ کا اتنا چاؤ ہے کہ مت پوچھو ـــــ یہ تو باپ سے بھی بڑھ گیا ـــــ جادا تو بہت اداس ہے ـــــ ہاں کیوں نہیں ـــــ جوانی میں یہ پہاڑ نہ ٹوٹتا تھا ـــــ قتل کیا ہو جس نے بھگوان اس کو ـــــ رام رام ـــــ‘‘ جب قتل کے بارے میں بولی تو اس کی اندھیری آنکھوں میں ایک لو جھلملا کر رہ گئی جیسے وہ سب جانتی تھی، یہ ذمہ داری رام کی تھی، رام جو دنیا میں انصاف چاہتا ہے، اور جس نے اپنی رانی کو دیش نکالا دیا تھا، ـــــ اور جس کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے رات کو پنڈت کتھا میں زمین اور آسمان کی کنڈی ملا دیتے۔ جادا امر جھا گئی۔ اس کا چہرہ اور زرد ہو گیا۔ آنکھیں دھنس گئیں گالوں پر جھریاں بل کھانے لگیں۔ اور چھاتی میں سانس کی جگہ انگاروں کی دوڑ شروع ہو گئی۔ وہ چلنا چاہتی تھی۔ روپا نے اس کا ہاتھ دبا کر بٹھا لیا۔ نیا مالک اندر آیا اس کے بال پریشان تھے۔ اس کے ہونٹ بھی پان سے لال تھے۔ وہ بھی پریشان معلوم ہوتا تھا۔ اس کی نظر روپا پر پڑی اور وہ مسکرا پڑا۔ پھر اس کی آنکھیں جادا سے ٹکرائیں۔ اور نگاہیں ’’ارے تم‘‘ بن گئیں۔ اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ غمناک ہونے لگیں۔ اور ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی آنکھوں میں جو چمک ابھی پیدا ہوئی تھی اس کو ایک سیاہ کمبل سے ڈھکنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

"روپا، دیکھنا، باہر والے دالان میں فرش لگانا ہے، چلکر لگادے، جادا کو لے لے ساتھ مدد کے لئے —— جلدی جلدی"

روپا کے اشارے پر جادا کو اٹھنا ہی پڑا —— "چل"

دونوں باہر والے دالان میں چھوٹے مالک کے ساتھ گھس گئیں، مگر جادا میں جھجک کا سر اٹھ رہا تھا۔ روپا یوں کھینچ نہ لیجاتی تو ہرگز وہ رام ناتھ کے حکم پر ٹس سے مس نہ ہوتی مگر روپا روپا تھی یا ٹیڑھی لکیر۔ اس کو سمجھنا ہی مشکل تھا۔ کہیں تو آنگن میں گویا لینے سے انکار کر دیا، اور کہیں ایک دم سے دوڑ پڑی گھوڑے کی طرح ——

"یہ دری چھیگی، ہے رچھی۔ نئی منگوائی ہے ناشہر سے" —— بہتر روپے اس پر صرف ہو گئے ہیں۔ لیکن پیسہ لگنے سے کیا ہوتا ہے۔ مال بھی تو مکھن دیا ہے، چوکھا، بڑھیا، اور یہ چاندنی بھی اسی پر چھیگی۔ کیسی اجلی ہے۔ لوگوں کو پہننے کو نہیں ملتے مگر یہاں کس چیز کی کمی ہے۔ میرے اشارے پر کپڑے کا تھان گھر میں تک جاتا ہے۔ ہاں روپا تو فرش خوب بچھاتی ہے۔ واہ، وا، —— پل میں ٹھیک کر دیا۔ اچھا تو اندر بھاگ کر جا، اور لے آ مسند، بوڑھی مالکن سے کہنا —— اور ہاں جادا تو ان شکنوں کو برابر کرتے —— ذرا چلے ہاتھ ——"

روپا دالان سے نکل گئی۔ جادا کا دل دھڑکنے لگا۔ رام ناتھ بھی شکنوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا اس کے قریب ہو گیا۔ اس نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ وہ بت کی طرح اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر تکنے لگی جیسے اس کی روح جم کر ایک مانگا بن گئی ہو ——

"دیکھنا جادا،" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "کب سے آگ لگی ہے" —— وہ پھر کھانسنے کو ایک لمحہ کے لئے رکا "آج یہاں ناٹک ہو گا —— تو مت آنا، ہاں، تیرے گھر پر بھی ناٹک ہو گا —— اور تیری قسمت کا اندھیرا —— ہی ہی ہو —— چاندی کی تھیلیاں ——" وہ اس سے آگے نہ سن سکی۔ وہ بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح بھیڑ کو چیرتی، شامیانہ کو روندتی، خوبصورت البیلے چھوکروں کے پاس سے گزر گئی، ڈوبتے سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر ناچ رہی تھیں وہ بھاگی جا رہی تھی، وہ تو دوڑ رہی تھی۔ —— اس وقت سوکھی ہوئی کوال مٹی کی طرح بھسی اور خستہ ساری کے ریزے ریزے ہو جانے کا ڈر نہ تھا۔ ساری پھٹ جائے، چور چور ہو جائے، وہ ننگی ہو جائے —— مگر وہ جلد از جلد گھر پہونچ جانا چاہتی تھی۔ وہ گھر کے پاس برگد کے پیڑ کے نیچے رک گئی۔ بیچ کھیت میں اسی درخت کے سائے میں اک کنواں تھا۔ چاروں طرف کا گھیرا ڈھ چکا تھا۔ اس میں پانی نہ تھا۔ اس میں اتھاہ خشکی پناہ گزیں تھی صرف ایک چٹان، اپنی ناک کی نمائش میں مبتلا جھانکنے سے ایک سادھو عبادت میں غلطاں معلوم ہوتا تھا۔ اس نے سنا تھا یہ کنواں بہت پرانا تھا، بہت پرانا، بہت پہلے، اس کی پیدائش، اس کے ماں باپ کی پیدائش سے پہلے اس کنویں میں پانی گردن تک تھا۔ اور اسی میں ایک دیوتا رہتا تھا، وہ شام کو پانی کی سطح پر دیا جلاتا، لیکن اس کی لو پانی کے اندر سے کانپتی ہوئی اگتی تھی۔ لوبان کی خوشبوئیں پھیلتیں —— کہنے والی تو یہ بھی کہا تھا کہ اب بھی جب سارا گاؤں سو جاتا ہے، ایک دم سناٹا چھا جاتا ہے، اس میں دیا جلتا ہے۔ پانی بھی گردن تک آ جاتا ہے، اور اسی لوبان کی خوشبوئیں دھم دھم پھیلنے لگتی ہیں —— اور ایک کراہ کے سینے سے ایک آواز بڑی قناعت سے پیدا ہوتی ہے —— اس میں زمیندار کی ننگی، مہربانی اور رنگینی کی باتیں ہوتی ہیں —— مگر جادا نے یہ سب کچھ سنا تھا۔ اور جس سے اس نے سنا تھا اس نے بھی کسی اور سے سنا تھا، اور اس طرح ہر کہنے والے کا سننے والا سلسلہ لامتناہی تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس گاؤں میں یا تو کہنے والے ہیں یا سننے والے، دیکھنے والا تو کوئی نہ تھا ——

وہ اپنے دروازے میں داخل ہوتے ہی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح گر گئی۔ آفتاب درختوں کے پیچھے افق پر سرخ آنچل پھیلا رہا تھا اس کے ذہن میں بھی کسی کی یاد کا آنچل لہرانے لگا تھا۔ نندلال، جو ڈیڑھ ماہ پہلے اس سے چھین لیا گیا تھا، اس کی آنکھوں میں

مسکرانے لگا۔ وہ مرا نہیں تھا، مار اگیا تھا۔ اور ان دنوں میں، جب سے وہ مرچکا تھا، وہ زندگی کتنی کٹھنائیوں میں الجھ کر رہ گئی تھی اس نے مہوا کھا کر پیٹ کو بہلانے کی کوشش کی تھی۔ اس کا چولھا تین چار شام سے بالکل بھوکا تھا۔ اس نے صبح ہی ایک مٹھی مہوا کھا کر پانی پی لیا تھا۔ مہوا سے دیسی شراب کی بو آتی تھی ـــــ پانی پینے کے بعد ڈکار سے اس کا حلق سڑی ہوئی شراب کا مزا اٹھاتا رہتا ـــــ اس کا سر چکراتا اور وہ آنکھیں بند کرلیتی۔ لیکن بھوک کا منھ بند ہوجاتا۔

نندلال جب اسے بیاہ کر لایا تھا تو اس کے گھر میں گائیں، بکریاں، بھینس اور ایک لیرو بھی۔ گائیں اور بکریاں تو کال میں سدھار گئیں۔ اور جو بیگھے زمین کے تھے وہ اس کے بیاہ پر گروی ہوگئیں اور اس طرح ہوئیں کہ وہ واپس نہ آسکیں۔ نندلال کو اس کا بہت افسوس تھا۔ وہ ہمت نہیں ہارا۔ وہ کھیتوں میں کام کرتا رہا ـــــ اس کی پیاری یادیں اس کے دماغ سے اس طرح لپٹ گئیں جیسے لٹھ سے لتی لپٹ جاتی ہے۔ اس کا سر ناچنے لگا۔ رقص جو ناتمام تھا۔ رقص جو صرف رقص نہ تھا، زندگی کا تلخ محور تھا کڑوی یاد! وہ لپک جو زندگی کو خوش انجام نہ بنا سکی۔ جس میں انجم و ماہ کی ٹھنڈک اور تابانی نہ تھی جس میں موت تھی، سراسر تاریکی تھی۔ صرف تاریکی یا تاریکی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ ساحل اور موج، ہر چیز تاریک، اور ماورا۔ وسیع ترین خلا میں پھڑپھڑاتی ہوئی تاریکیاں ـــــ زندگی اور تاریکی، ایک ہی چیز کے دو نام معلوم ہوتے تھے۔ لیکن نندلال کہتا ـــــ "گھٹا ٹوپ اندھیرا ختم ہوگیا ـــــ سورج تو نکلنے دو" اور وہ دور افق کی طرف گہری نگاہوں سے تکنے لگتا جیسے سورج کی دھمک محسوس ہو رہی ہو۔

شادی کو چند ہی روز ہوئے تھے اور نندلال ہار سنگار کے پھول لیتا آیا تھا۔ اور اس کے چھوٹے سیاہ بالوں کے جھرمٹ میں بکھیر دیئے تھے۔ جیسے سیاہ مخملیں کپڑے پر ریشمی پھول کاڑھے گئے تھے۔ پھر وہ اپنے منھ سے ایک پھول چن کر چبانے لگا تھا، ـــــ اور جب اس کا مزہ خراب معلوم ہوا تو اس کا منھ بگڑ گیا، وہ تھوکنے لگا۔ اور اس کی بیوی سر نہوڑا کر دیر تک ہنستی رہی۔

"او ہنستی ہو ـــــ بجلی گراتی ہو ـــــ میں کیسے سہاروں، جی چاہتا ہے ـــــ" اور جادو اسی طرح ہنسی کی شدت کو ہوا دیتی ہوئی آگے جھکی، اور اس کی ہتھیلی اس کے منھ پر چپک گئی تھی۔ اس میں سے مہندی کی ٹھنڈی اور میٹھی مہک اٹھ رہی تھی اور اس نے اس کی ہتھیلی کو چوم لیا تھا۔

وہ شام تو اسے اس طرح یاد تھی جیسے ابھی ابھی کی بات ہو۔ پچھلی ہی برسات کے اساڑھ میں تو وہ اس کے ساتھ باہر کھیتوں میں اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے جانے لگی تھی۔ بھادوں کا پانی خوب برسا تھا۔ جیسے نکسیر پھوٹ گئی ہو۔ کھیت یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں گدلا پانی جم گیا تھا۔ مچھر اڑ رہے تھے، مینڈک اور جھینگروں کی انتھک تانیں فضائیں کانپ رہی تھیں۔ اور وہ روپنی میں لگی ہوئی تھی۔ عورتیں گیت گا رہی تھیں۔ وہ لپک رہی تھی۔ نندلال نے ان میں جادو بھر دیا تھا۔ "روپنے والا کھائیگا" لوگوں کو اس پر پورا یقین تھا اور وہ کھیت میں دھان نہیں بو رہے تھے بلکہ اپنے اپنے پیٹ میں۔ زمیندار کے خلاف آگ تیز جل رہی تھی۔ لنکا جلانی والا دراون کی گردن کا خون سرسرا رہا تھا ـــــ اور وہ گائے جا رہی تھیں ـــــ "پردیسی تم کہتے ہو کہ میں تم سے پیار کروں۔ مگر بھوک میں پیار نہیں ہوسکتا۔ تم پیارے ہو، مگر دھرتی بھی تو پیاری ہے۔ تم کیوں میرے ساتھ مل کر، کیچڑ میں، پانی میں، سڑی ہوئی بو میں اپنا سر جھکا کر موری نہیں بو دیتے ـــــ ایسا کرو تو جیون میں آگ جل اٹھے ـــــ اور جیسے جیسے دھان کے پودے اگیں، ہمارا پیار بھی اگے ـــــ اور بک کر لہلہانے لگے ـــــ کیوں پردیسی کس سوچ میں ہو ـــــ آؤ ـــــ آؤ ـــــ میرے ساتھ آؤ ـــــ" یہ سندیسہ اسے آج بھی یاد تھا۔

ان کے چہروں پر زرق برق مسکراہٹوں کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ وہ طوفان جو نہیں تھمے گا۔ طوفان جو تنکوں کو کیا محلوں کو بہا لے جائیگا۔ مرض، دکھ، تیج سب مٹ جائیں۔ طوفان، ایسا طوفان۔ نندلال نے اس کی میلی کلائی سے سوکھی ہوئی کیچڑ

کا ٹبن توڑتے ہوئے کہا تھا۔ "آج تو چول چول دکھتی ہوگی جاوا ـــــــ بگھراؤ مت، اب کے قرض ٹوٹ جائیگا۔ اپنا کھیت ہوگا اپنا غلہ، اپنی مرضی، اپنا دن، اپنی رات ـــــــ ہے نا؟" وہ صرف مسکراتی رہی تھی۔ جیسے نندلال کی آواز مشیت کی آواز تھی شام کا پھیلتا ہوا سایہ ایک تیز آرے کی طرح روشنی کی کلائی کاٹ رہا تھا۔ اس روز ان لوگوں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا تھا، رات گئے تک چاند اور بادل کا تماشہ دیکھتے دیکھتے وہ ایک دوسرے کو چھیڑتے رہے تھے ـــــــ آنگن سے وہ نہ ہٹے، حالانکہ ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی، اور فضا نم تھی۔ اور دن کی بارش سے آنگن میں پھسلن تھی، مگر اسی پر چٹائی بچھائے وہ آسمان پر نظریں گاڑے ہوئے تھے ـــ اور بار بار جاوا کے ذہن میں خیال آرہا تھا کہ اب کے قرض ٹوٹ جائیگا۔ فضا میں خمار تھا کیف آگیں اور لذت بداماں۔ وہ کیسے بھولے گی وہ رات۔ اس کی آنکھیں اس رات کی طرح بھیگ گئیں۔ جس میں نہ خمار تھا، نہ کیف، نہ لذت

نندلال فصل کٹتے ہی آندھی طوفان کی طرح کام کرنے لگا تھا۔ کسانوں نے موقع پاکر غلے کاٹ لئے۔ لیکن ہندو مسلمان کے دنگوں نے کام میں بڑی رکاوٹ پیدا کی۔ بلوہ کی روک تھام کے نام پر کسانوں کو ظلم و تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ دنگو کو روکنے والی فوج دراصل آسودہ گدھوں کی طرح زمینداری کی لاش اگورنے لگی۔ پھر بھی بہت کچھ ہو گیا تھا۔ اور وہ ایک کیل کی طرح رام ناتھ کے سینے میں گڑ گیا تھا۔ لیکن وہ کیل آخر نکل ہی گئی۔ وہ شکری ندی کے کنارے مرا ہوا پایا گیا۔ اس کا سر نہیں ملا۔ اس کا جسم جو گٹھیلا تھا ـــــــ خون میں لتھڑا ہوا پڑا تھا۔ زرد جسم جسے جاوا بغیر سر کے بھی پہچان سکتی تھی۔ وہ چیخ بھی نہ سکی، رو بھی نہ سکی۔ اس کے آنسو جم گئے اور چیخیں حلق میں پتھر کے روڑے کی طرح اٹک گئیں۔

اس کے دماغ میں ایک ایک بات کبھی ترتیب وار اور کبھی غیر مسلسل یاد آرہی تھیں۔ کبھی ادھر کی بات کبھی ادھر کی نندلال کا چہرہ ہر طرف سے جھانکتا ہوا معلوم ہوتا۔ مسکراتا ہوا، زرد چہرہ۔ جس پر چیچک کے نشان دھوئیں کے باریک ذروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ ناک سڈول سی تھی۔ اور مونچھیں وہ ایسی بیوقوف سی رکھتا تھا کہ جاوا کو کبھی پسند نہ آئیں۔ لیکن کھیت میں کام کرتے کرتے جب اس کی مونچھیں کیچڑ میں لت پت ہو جاتیں، تو اس کا چہرہ جگمگانے لگتا تھا، وہ چپکے سے نگاہوں ہی نگاہوں میں اس کی مونچھوں کو چوم لیتی تھی۔

سوچتے سوچتے اس پر اونگھ سی چھا گئی۔ اور جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک تاریک شکنجہ میں بند ہے تاریک رات کے شکنجے میں۔ اور چاروں طرف سے اندھیری نہریں دوڑ دوڑ کر اس کی زندگی کی گہرائی میں گر رہی تھیں۔ اسے اپنے اندر اور باہر، صرف تاریکی کے بگولے ہنہناتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اندھیرا فضا میں اس طرح گھل گیا تھا جیسے آنسوؤں میں کاجل ـــــــ

دور سے "جے جے رام، جے جے جے" کی وجدانی چیخیں آرہی تھیں۔ اور گیس کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ جگنو چمکے تو چمکنا بھول گئے۔ اس کا دل سہم گیا۔ "ناٹک ـــــ ناٹک" اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ذہن کو رام ناتھ کی باتیں آگ میں جلی ہوئی سرخ سیخوں کی طرح کریدرہی تھیں۔ وہ بھاگ جانا چاہتی تھی۔ وہ اس ناٹک سے بچنا چاہتی تھی۔ اسے ناٹک سے نفرت تھی۔ ایک رات اور اسے یاد آگئی جب کتھا سننے کے لئے وہ نزدیک والے گاؤں سے اس گاؤں میں آئی تھی۔ رام ناتھ کا باپ زندہ تھا۔ اور رام ناتھ پرشادی بانٹ رہا تھا۔ اور جب وہ مٹھائی لیکر نکلنے لگی تھی تو اچانک اس نے اسکی بغل میں گدگدایا تھا۔ اور اس کے ہاتھ کی مٹھائی زمین پہ جا رہی تھی۔ پھر وہ پرشادی کے لئے پکارتا رہا لیکن وہ اپنے گاؤں پہونچ کر رکی۔ اور اسی روز سے اسے اس مردود رام ناتھ سے نفرت ہوگئی تھی۔ اسے زندگی کے ہر دور میں تاریک راتوں نے ستایا تھا۔ وہ یہ کیسے بھول سکتی تھی۔

برگد کے پاس ایک سایہ نظر آیا ہر طرف سناٹا تھا۔ صرف رام ناتھ کے گھر میں زندگی تھی۔ اس کا دماغ ایک خطرناک وہم

سے گھبرا اٹھا۔ وہ بھاگی مگر بالو کے ڈھیر میں پھنس کر گر گئی۔ اس کی دونوں مٹھیوں میں بالو بھر گئے۔ جیسے وہ اسے خطرے سے بچا لیں گے وہ سایہ نہیں تھا دیو تھا، سیاہ، گہن والی رات کی طرح سیاہ۔ اور اس کے ناخن گز گز بھر کے تھے۔ اور گالوں کو چیر کر ہاتھی کے دانت کی طرح دو تیز دانت لٹک رہے تھے، اور آنکھوں سے آگ کی زبان لپک رہی تھی۔

وہ اٹھی اور بھاگنے لگی۔ لیکن سیاہ دیو نے ساری کھینچ لی ——— وہ ننگی تھی، لیکن تاریکی کا لباس اتنا کسا ہوا تھا کہ اس کے سوا اور کوئی نہ جان سکتا تھا کہ وہ مادر زاد ننگی تھی۔ وہ عورت تھی جس کے جسم پر کپڑا نہیں تھا۔ اور دو مضبوط ہاتھ اس کے بازو کو ٹٹولنے لگے، وہ ساکت تھی۔ وہ پہاڑ کی چوٹی پر لٹکا ہوا ایک پتھریلا مجسمہ تھی۔ اور وہ اسے جھنجھوڑ رہا تھا ——— یکایک مجسمہ ٹوٹ کر آدمی بن گیا۔ اور اس کی دونوں مٹھیوں کا بالو سیاہ سائے کی آنکھوں میں چھلانگ گیا۔ اور وہ بھاگی ——— برگد کا درخت، دیوتا کا کنواں ———
اس نے محسوس کیا کہ تاریکی میں وہ ایک لمحہ کے لئے معلق ہو گئی ہے ——— پھر وہ چٹان میں جذب ہونے لگی۔ اور گنویں کی گہرائی کم ہوتی گئی ——— کم اور کم۔ اس کی آنکھوں میں تاریکی کے بھنور سے اڑنے لگے۔ جو پھیلتے اور پھولتے گئے یہاں تک کہ وہ ایک گول آسمان بن گئے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ اور وہ سیاہ ترین انڈے کے چھلکے میں بند تھی۔

کسی کی چاپ ایک طرف دور ہوتی گئی۔

جادو نے اپنی گردن پر انگلیاں پھیریں۔ اور اسے بھادوں کی بھیگی ہوئی کھیت کی مٹی یاد آ گئی۔ مٹی ٹھنڈی ہوتی تھی اور ایک گرم لمس تھا۔ سوزش بھاپ بن کر اٹھی اور بکھر اس سیاہی کے حلق میں اٹکنے لگی۔ اور وہ ایک بلند ترین سیاہی کے جزیرے میں محرم کے علم کی طرح نصب ہو گئی۔ پھر وہ اٹھنے لگی، اٹھتی گئی، جس کے سر پر اس کی جھونپڑی سے بھی بڑا سیاہ الّو بیٹھا تھا ——— اس کی آنکھیں کلغی کی طرح چمک رہی تھیں ——— کہیں سے آواز آ رہی تھی ——— "اب کے قرض ٹوٹ جائیگا جادوا ——— جادوا ——— جادوا ——— پھر ناٹک کا شور "جے جے رام ——— جے جے جے" ——— جس کے کلیجے کو چھیدتی ہوئی ایک بوڑھی روح کی چیخ اس کے کانوں میں گونجنے لگی ——— روح میں چبھنے لگی ——— اور چھاتی کو روندتی چلی گئی ———

"میرے بچے کو پوجا پاٹ کا اتنا چاؤ ہے کہ مت پوچھو ——— "

(بقیہ آدم خور)

دوسرا دن گذر گیا۔ سواریٔ شاہ نہیں آئی۔ مگر بادشاہ جہان پناہ ایک ریوڑ ہانکنے والی نوجوان لڑکی کو چیر پھاڑ کر کھا گئے۔

تیسرا دن گذر گیا۔ جہان پناہ نہیں آئے۔ مگر ڈونگر کے قریب جہان پناہ نے ایک پردیسی مسافر کو نگل لیا۔

چوتھا دن گذر گیا۔ بندگان عالی کے قدوم میمنت لزوم کے لئے گاؤں بیتاب ہو رہا تھا، مگر بندگان عالی نے ایک چرواہے لڑکے کو نوالہ بنالیا۔

گاؤں والے پریشان ہو گئے کہ اب کیا کیا جائے۔ شیر کے ظلم یا بادشاہ کے انتظار کی ایک حد ہوتی ہے —— یا حد ہوتی ہی نہیں —— نہیں نہیں ایسے کام نہیں چلیگا۔ ایسی کی تیسی۔ یہ کہہ کر مادھو کسان کا نوجوان لڑکا شامو چودی سے بندوق لیکر چھپتا چھپاتا جنگل کی طرف چلا —— ابھی وہ پٹواری کے کھیت تک بھی نہ پہنچا تھا کہ اُسے ایک طرف ڈونگر میں شیر کے چنگھاڑنے کی آواز آئی اور دوسری طرف سے بادشاہ سلامت کی سواریٔ مبارک آتی نظر آئی۔

اب شامو پریشان ہو گیا کہ وہ کس کو مارے؟ ۔ دونوں میں سے کونسا شیر زیادہ خونخوار ہے ——؟

جب سواریٔ جہان پناہی بہت قریب آگئی تو مرتا کیا نہ کرتا شامو نے بندوق کی نال حضور پرنور کی طرف اٹھادی ابھی اس کا ہاتھ لبلبی تک بھی پہنچا نہ تھا کہ بادشاہ کے شکاری کتے جھپٹے اور۔۔۔۔۔۔۔

اور پھر بادشاہ شامو کی تکا بوٹی نوچتا رہا اور اُدھر ڈونگر میں شیر بیچارا بھوک کے مارے چنگھاڑتا ہی رہ گیا۔

(بقیہ یاد نہ کر دل حزیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

جنھوں نے میرے پیارے پنجاب کے نام پر دھبہ لگا دیا۔

"کیا میں ہندو تھا؟ یا مسلمان؟ مسلمان تھا یا ہندو؟"

یہ ہی سوال دن رات ان کا تعاقب کرتا رہیگا، شہروں میں اور گاؤں میں، کارخانوں کی مشینوں کی سنسناہٹ میں، ٹراموں، بسوں اور ٹرینوں کی کھڑکھڑاہٹ میں، کنویں کے رہٹ کی مترنم آوازمیں اور گاؤں کے کولہوؤں کی چرچوں میں وہ برابر یہی دہشتناک سوال سنیں گے: "کیا وہ ہندو تھا یا مسلمان؟"

نہ وہ نہ ان کی اولاد اور نہ اولاد کی اولاد کبھی سکون سے آشنا ہوں گے —— میرا انتقام خوفناک ہوگا بہت ہی خوفناک؟۔

"کیا اب بھی آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں اپنی موت کے اتنی دیر بعد کیوں ہنس رہا ہوں؟"

(بقیہ عمل اور ردّ عمل)

شاہینہ کو ہنسی آئی، بیوقوف کہیں کا، تتلیاں بھی کہیں اس طرح ہاتھ آتی ہیں۔ اس کے جی میں تو آیا کہ خوب قہقہہ لگا کر ہنسے ——

سامنے مکان نظر آرہا تھا۔ اور وہ لیٹی لپٹائی چلی جا رہی تھی۔ دادی اماں دیکھ کر کتنا خوش ہوں گی۔ مگر شاہینہ کے دل میں بار بار ستا رہا تھا کہ وہ خوش ہو یا آزردہ —— اختر نے چلتے ہوئے پانی پر ڈھیلا مارا —— پانی میں جیسے ہلچل مچ گئی۔ چاند کانپ اٹھا —— لیکن پھر ٹھہر گیا —— لہریں رک رک کر سانس لینے لگیں —— اور پانی کی سطح پر حلقے بن بن کر مٹ رہے تھے ——

ایک تعارف!

بھوپال کی صنعت و تجارت

انڈیا فلم کارپوریشن لمیٹڈ

وسط ہند کا یہ فلمساز ادارہ بھوپال میں ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا، ۵ لاکھ کے سرمایہ سے کاروبار شروع کیا اور ایسٹرن اسٹوڈیو بمبئی میں اپنی اولین تصویر "نئی ریت" ستمبر ۱۹۴۷ء سے شروع کر کے فروری ۱۹۴۸ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچائی۔ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا شاہکار ہی انڈیا فلم کارپوریشن کو چمکا دے گا۔ "ہلچل" اور "تلی" آئندہ پروگرام میں شامل ہیں۔ کمپنی کے مینیجنگ ڈائرکٹر مسٹر للوانی کے شب و روز کے انہماک نے اس فلمساز ادارہ کو بہت جلد ارتقائی منازل پر پہنچا دیا ہے۔ کمپنی کے ڈائرکٹران کی فہرست حسب ذیل ہے:-

۱۔ کرنل ممتاز علی خاں (والا قدر)	چیئرمین
۲۔ مسٹر دار مل للوانی	مینیجنگ ڈائرکٹر
۳۔ نایاب علی خاں	ڈائرکٹر
۴۔ رام نرائن سنہیل	مینیجنگ ڈائرکٹر
۵۔ سیٹھ گوپال داس ایم۔ ایل سی	ڈائرکٹر
۶۔ لکشمی نرائن سنہیل اسٹیٹ جوہری	"
۷۔ ملا یوسف علی	"
۸۔ بابو لال	"
۹۔ سیٹھ منا لال جوہری ساگر والے	"
۱۰۔ رائے سیٹھ نرائن داس سیہور	"
۱۱۔ سیٹھ لکشمی نرائن (دتی لال نند ابن داس)	"
۱۲۔ سیٹھ متھرا پرشاد اگروالی	"
۱۳۔ عادل رشید	

نادرہ

نادرہ الائیڈ انجینیرز (رجسٹرڈ) ۱۹۳۸ء میں قائم ہوئی اور مسٹر اختر عباس کی مخلصانہ جدوجہد اور فہم و فراست سے جلد ہی عروج پر پہونچ گئی۔ کلینک اور میڈیکل ہال کے علاوہ اب دیسی دواخانہ بھی قائم ہوگیا ہے۔ یہ ادارہ سنٹرل انڈیا اور قرب و جوار کی ریاستوں میں پیٹنٹ انگریزی ادویات فراہم کرتا ہے اور بھوپال میں ان دواؤں کا سب سے بڑا اسٹاکسٹ ہے۔

اسٹوڈینٹس کمرشل

اعلیٰ تعلیمیافتہ مسٹر منظور حسن بی۔اے کی تجارتی دلچسپی نے اس ادارہ کو جنم دیا، اور جلد ہی ترقی کر گیا ہے۔ طلباء کی ضروریات کی فراہمی میں پوری طرح سرگرم ہے۔ ٹائلیٹ کا سامان اور دیگر اشیاء بھی ملتی ہیں۔

بھوپال بینک

نومبر ۱۹۴۴ء میں قائم ہوا، ساڑھے بارہ لاکھ کے اداشدہ سرمایہ سے کاروبار شروع ہوا۔ اعلیٰ حضرت تاجدار بھوپال نے بنفس نفیس افتتاح فرمایا۔ بینک کے جنرل منیجر مسٹر مسیح الدین نے اپنے تجربہ اور مستعدی سے دو سال میں اسے کامیاب ترین ادارہ بنا دیا اور اب کراچی میں بھی اس کی شاخ کھل گئی ہے۔

بھوپال پریس

چند تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بلند ہمتی اور اشتراک سے اس کا قیام عمل میں آیا، جہاں زنک کی پلیٹوں پر نفیس طباعت کیجاتی ہے۔ مسٹر غضنفر علی خاں کی انتھک کوششوں سے پریس برابر ترقی کر رہا ہے۔

بھوپال ٹاکیز

۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء میں قائم ہوا، بھارت پکچرز لمیٹڈ اکولہ کی ملکیت ہے۔ وسط ہند میں اپنی قسم کا خوبصورت اور بے نظیر پکچر ہاؤس ہے۔ مسٹر مصباح الدین جیسے منتظم جرنلسٹ اس کے منیجر ہیں۔ اور مسٹر لچھمن راؤ ان کے معاون ہیں۔

بھوپال ریسٹوراں

یہاں تمام ترقی پسند چائے پر جمع ہوتے ہیں اور ادبی تخلیق کے لئے پُرکیف فضا پاتے ہیں، آج اس کو "تاج محل" بنانے میں مصروف ہے۔

بھوپال فرنیچر ورکس کئی سال سے اطمینان بخش چوبی کام کر رہا ہے۔ نفیس اور طرز نو کا فرنیچر بھوپال، و بیرون بھوپال فراہم کیا جاتا ہے۔

عنایت اللہ-کرامت اللہ ہر دو بھائی صاحبان بھوپال کے قدیم عطر ساز ہیں۔ ۱۸۹۲ء سے ان کا کاروبار جاری ہے۔ ان کے تیار کردہ بالوں کے تیل اور عطریات کی سارے ہندستان میں دھوم ہے۔ قنوج سے قدیم نسبت ہے اور دونوں بھائی بہت ہی با اخلاق اور با مروت ہیں۔

گوردھن داس یہ دکان ۵۰ سال سے قائم ہے اور برابر ترقی کر رہی ہے۔ گرین مر جنرل مرچنٹ، کمیشن ایجنٹ اور کرانہ ایجنٹ ہیں۔ پلاسٹرس اور سواستک آئل ملز کے ڈسٹری بیوٹرس بھی ہیں اور بڑی کامیابی سے اپنی تجارت کو ترقی دے رہے ہیں۔

جنرل ٹرانسپورٹ یہ بھوپال کے مالکان موٹر کی واحد متحدہ یونین ہے۔ مسافروں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں جس سے مسافر ہمیشہ مطمئن رہتے ہیں۔ خلیل [illegible] جیسے بالغ نظر ادیب اس کے سکریٹری ہیں۔

جویرچند موتی لال نصف صدی سے یہ دکان قائم ہے۔ موتی لال جین آنجہانی اس کے بانی تھے۔ اعلیٰ قسم کی سگریٹوں اور بیڑیوں اور صابنوں کو ڈسٹری بیوٹرز ہیں۔ ہر قسم کے سنگار کا سامان بھی دستیاب ہوتا ہے۔ دونوں بھائی نہایت ہی خوش اخلاق اور بذلہ سنج ہیں۔

غلام عباس قربان علی یہ دکان بہت قدیمی ہے۔ بھوپال کے جنگلات کی شیریں پیداوار "شہد" سے لذت کام و دہن فراہم کرتے ہیں۔

گولڈن سوپ فیکٹری یہ بھوپال کا مشہور صابن سازی کا کارخانہ ہے جو حکیم عبدالحمید صاحب جیسے تجربہ کار ماہر فن کی نگرانی میں ۱۹۴۰ء سے کام کر رہا ہے۔ موصوف ۱۴ کتابوں کے مؤلف بھی ہیں۔ "مون لائٹ سوپ" آپ کی تازہ ایجاد ہے "حمیدیہ خضاب" بھی اس کارخانے کا تمام ہندوستان میں بیحد مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

اصفہانی ٹی ایجنسی مسٹر حسنین اس کے انچارج ہیں اور حال ہی میں اسکو جبل پور سے منتقل کیا ہے۔ یہ چاء خوش ذائقہ اور نفیس خوشبو کی ہوتی ہے۔ امید ہے کہ مسٹر حسنین کی سرکردگی میں یہ ایجنسی بہت جلد ترقی کریگی۔ اور تمام مارکٹ پر چھا جائیگی۔

فرینڈس کوآپریٹو ایجنسی دوستوں کی یہ فرم مسٹر بادی جیسے اولوالعزم نوجوان کے ہاتھوں ۱۹۴۴ء میں قائم ہوئی ہے۔ بجلی کا ہر قسم کا سامان اور پنکھے وغیرہ کی خاص طور پر سپلائی کی جاتی ہے۔

دارالعلاج مسعودی مشہور اور ماہر فن حکیم سلطان مسعود صاحب کے زیر اہتمام یہ ۲۰ اپریل ۱۹۴۲ء کو قائم ہوا۔ حکیم صاحب موصوف بڑی توجہ اور ہمدردی سے علاج کرتے ہیں۔ ماء اللحم روح افزا، شربت مفرح، فیضنک مرہم، عرق فواکہ عنبری، معجون لبوب کبیر کلاں، اور معجون مغلظ یہ نسخہ کلاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بمبئی انجینیرنگ ۱۹۳۲ء سے قائم ہے۔ مسٹر امیر حسن مالک ہیں۔ بجلی کا سامان، ریڈیو اور زرعی مشینری کے خصوصی سپلائر ہیں۔

نور برادرس تصویرکشی کا یہ ادارہ جدید قسم کے ساز و سامان سے لیس ہے۔ مسٹر نور بھوپال کے سابق اسٹیٹ فوٹوگرافر مسٹر سراج الدین کے فرزند ارجمند ہیں جنھیں بھوپال کے مشہور حسن کار نمکین میاں سے خصوصی نسبت حاصل ہے۔

میسرز ..... ایم۔ اے اینڈ کو یہاں خواتین کی آرائش اور سنگار کا تمام سامان دستیاب ہوتا ہے، خوبصورت زیورات، رنگین چوڑیاں، دلکش آویزے قابل ذکر اشیاء ہیں۔

NAI REET



SULOCHNA CHATTERJI

سلوچنا چٹرجی ۔ ادارہ فلم انویسٹرز لمیٹڈ بھوپال کی پہلی پیشکش "نئی ریت" میں



سیفی اور ثنا

نئی ریت

فلمساز ادارہ : ـــــ انڈیا فلم کارپوریشن لمیٹڈ بھوپال۔
ڈائرکشن : ـــــ ایس، کے، اوجھا۔
کہانی گانے اور مکالمے : ـــــ رتن کمار بی اے اور بالکرشن گپتا۔
موسیقی : ـــــ ایس، کے، پال

خاص اداکاران :

سلوچنا چٹرجی ✤ راجندر
گیتا بالی ✤ کرشن کانت

کہانی

یہ کہانی دو زمانوں کے سنگم کی کہانی ہے۔ خیالات کے تانے بانے اور جذبات کے اُتار چڑھاؤ کی کہانی ہے۔ پرانی روایات اور نئی ریتوں کے تصادم کی کہانی ہے۔ زندگی کا ہر روپ نیا ہے ہر جگہ انوکھا ہے۔ اس رنگا رنگی میں صحیح اور غلط کا امتیاز۔ ہار اور جیت کا فیصلہ ایک کٹھن کام ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی بندو پر پہلی بجلی گری بندو کا باپ۔ بندو اور اُس کی ماں کو عالم بیکسی میں چھوڑ کر چل بسا۔ لیکن دنیا میں فرشتہ صفت اور نیک لوگوں کی کمی نہیں۔ بندو اور اُس کی ماں مادھو دادا جیسے انسان دوست کے گھر پہونچکر پناہ لیتے ہیں۔ اس نئے گھر میں بندو کو ہر طرف سے پیار، محبت اور ہمدردی ملی، اُسی کے سہارے اس کی زندگی کی بیل پروان چڑھنے لگی اور مادھو دادا کے لڑکے انوکھے کی محبت نے بندو کے دل پر اپنے نقش بھی بنانا شروع کر دیا۔ انوکھے لاکھ سیدھا سہی، ان پڑھ سہی مگر وہ انسان تھا اور اُسے بھی قدرت نے ایک محبت عطا کرنیوالا دل عطا کیا تھا۔ بندو کے روپ میں وہ اپنی کامیاب زندگی کے ان گنت اور رنگا رنگ

خواب دیکھنے لگا۔ روپہلے اور سنہرے خواب حسین و دلفریب خواب، سوتے اور جاگتے خواب، ہنستے اور کھیلتے خواب۔ بندو ان خوابوں کی زندہ تعبیر تھی۔ وہ بندو جو صرف محبت کے لئے پیدا ہوئی تھی —— لیکن بادھو دادا کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ اور وہ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اُن کا سادہ لوح انوکھے بندو جیسی باسلیقہ اور قسمت آب لڑکی کے معیار پر پورا اتر سکتا ہے۔ اُنھوں نے بندو کی ایک خوشحال گھرانے میں شادی کر دی۔ اس اہم فرض کو انجام دیکر بادھو دادا بہت خوش اور مطمئن ہو گئے۔ لیکن اگر ایک طرف بندو۔ اس غیر متوقع شادی سے حواس باختہ رہ گئی اور ہندستانی لڑکی کی طرح بڑے بوڑھوں کی مرضی پر اپنی خوشیوں کو نچھاور کرنے کے لئے آمادہ ہو گئی تو دوسری طرف انوکھے بھی چکرا کر رہ گیا۔ وہ سوچتا رہا کہ آخر اس میں کیا عیب تھا۔ اس میں کیا برائی اور کھوٹ تھا، جو وہ بندو کو نہ پا سکا۔ بندو اُس کی نہ ہو سکی۔ اُس کے خوابوں کا حسین رنگ محل زلزلے کے ایک جھٹکے کی طرح زمین پر آ رہا اور وہ صرف دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ لیکن بندو اور انوکھے صرف اپنے متعلق سوچتے رہ گئے اور قسمت۔ قسمت ان دونوں کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ کو سوچ رہی تھی —— سائنس کا گریجویٹ کمل کانت بندو جیسی خوبصورت، گھر گرہست اور خدمتگذار بیوی کو پا کر جیسے زندگی کا سارا سکھ چین پا گیا۔ بندو کے ساس سسر اپنی بہو کی تعریف کرتے نہ تھکتے۔ وہ پھولے نہ سماتے، جب وہ یہ دیکھتے کہ اُن کی بہو کی محبت اور بے پناہ خدمت نے اُن کے بیٹے کمل کو گھر بار کی ذمہ داریوں کا احساس دلا دیا ہے۔ وہ خوش تھے کہ تعلیم کا دیوانہ کمل اب بندو کا دیوانہ بن گیا ہے۔ اور اس وقت تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب کمل اور بندو کی محبت کی نشانی چاند جیسے ننھے نے گھر کی رونق میں اضافہ کر دیا۔ اگر جنت کا تصور غلط نہیں تو گوری دادا کی یہ چھوٹی دنیا بھی رشک جنت تھی —— اور اب یہیں سے کہانی ایک نیا موڑ لیتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا جذبہ کمل کو زیادہ عرصہ تک گھر کی جنت سے نہ بہلا سکا۔ وہ ایک دن بمبئی جانے کیلئے تیار ہو گیا۔ بندو اپنے شوہر کو بڑا آدمی دیکھنا چاہتی تھی۔ اُس نے خوشی خوشی نیک تمناؤں کے ساتھ کمل کو وداع کیا۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ وہ کمل کو کیا بننے کے لئے بھیج رہی تھی —— سائنس کالج کا ادھیڑ عمر دالا پرنسپل ڈاکٹر راسے اور اس کی خوبصورت اور پڑھی لکھی نوجوان بیوی جوالا —— یہ رشتہ اپنی نوعیت کا کتنا ہی عجیب تھی۔ دونوں کی زندگی میں ربط کیونکر قائم ہوا۔؟ ہوا بھی کہ نہیں۔ شادی ہوئی تو کس طرح ——؟

یہ سب باتیں تجربہ کار ڈاکٹر راسے کے صرف ذہنی پردوں تک محدود تھیں۔ لیکن اُس کے باوجود جاننے والے بہت کچھ جانتے تھے، سب کچھ جانتے تھے۔ گھر گھر اس دلچسپ جوڑے کے چرچے ہوتے تھے۔ مگر کمل کانت کو ان باتوں سے دور کا بھی تعلق نہ تھا، وہ تو ایک شوقین اور محنتی طالب علم کی طرح تحصیل علم میں لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر راسے کمل کی ذہانت اور اس کی بے پناہ صلاحیتوں کے بیحد معترف تھے اور جوالا۔ جوالا اس کی بے پروائی سادگی اور بھولے پن کی دیوانی بن گئی تھی۔ کمل جتنا جوالا سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتنا ہی جوالا اسے اپنے قریب لا رہی تھی اور اور آخر کار وہ جوانی اور محبت کے اندھے طوفان میں بے اختیار کود پڑی۔ کچھ کھونے کے لئے کچھ پانے کے لئے۔ کمل ایک انسان ہی تو تھا۔ جوالا کی جوالا مکھی نے کمل کے پتھر دل میں بھی محبت کی چنگاری سلگا ہی دی۔ اور جب کمل ایک طویل جدائی کے بعد گھر آیا تو وہ کوئی دوسرا ہی کمل تھا —— بندو —— جو انتظار کی طویل اور مختصر راتوں میں صرف حسین یادوں کے سہارے زندہ تھی۔ محبت کے دو میٹھے بول بھیک میں لینے کے لئے دامن پھیلائے اس کی طرف بڑھی۔ مگر کمل تار پاتے ہی پھر بمبئی لوٹ گیا۔ اور بندو سوچتی رہ گئی —— ؏ وہ بات نہ کی اور چلے گئے —— وہ روتی رہی اور گاتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی مغموم فضا اداس ماحول اور غمگین زندگی روتی رہی اور گاتی رہی ؏ وہ بات نہ کی اور چلے گئے —— لیکن یکایک اس کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو سہارا دینے کے لئے انوکھے آپہونچا —— وہ انوکھے جو صرف اس لئے زندہ تھا کہ زندگی کے کسی لمحہ میں شاید وہ اپنی بندو کے کام آسکے۔ اس نے حالات کا جائزہ لیا اور سیدھا بمبئی پہونچا۔ کمل کو برا بھلا کہا اور پھر لوٹا تو کمل کے ماں باپ کے لئے بندو کی دوراندیشی، تدبر اور ضبط و تحمل سے بھلا اسے کیا واسطہ —— وہ ٹھہرا جاہل، اکھڑ اور سپاٹ انسان، وہ جو کچھ کر رہا تھا بندو کے لئے بندو کی زندگی کے لئے —— بندو کے سکھ چین کے لئے۔ وہ یہ نہیں برداشت کر سکتا تھا کہ اس کی بندو اس کے ہوتے ہوئے اداس اور غمگین رہے۔ وہ تو اسے سدا خوشی کے جھولے میں دیکھنے کا آرزومند تھا۔ کمل کی خاطر۔ بندو نے سکول میں نام لکھوایا، مگر وہاں بھی اس کا جی نہ لگا۔ وہ کیا کرتی کہ اس کے دل پر تو شوہر، ننھا، ساس اور سسر کے الفاظ مرتسم ہو چکے تھے۔ جو انمٹ تھے۔

ایک طرف کمل تھا۔ دوسری طرف بندو۔ کمل کی مجبوری یہ تھی کہ وہ بندو کے ساتھ اعلیٰ زندگی کی خوشیاں نہیں حاصل کر سکتا تھا —— اور بندو کی بے بسی یہ تھی کہ وہ کمل کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ ادھر ڈاکٹر راسے کے ہاتھ میں اس کے بنائے ہوئے انجکشن کی ایک پچکاری بھی تھی، جو ایک ساعت میں جوانی کو بڑھاپے اور خوبصورتی کو بدصورتی میں تبدیل کر سکتی تھی۔ سامنے جوالا کھڑی تھی۔ ڈاکٹر راسے پچکاری لیکر آگے بڑھا ہی تھا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کمل کی جیت ہوئی یا جوالا کی ہار —— دونوں نے اپنے کو بے گناہ اور معصوم ثابت کرنے کی [illegible]

شروع ہوئی۔ صاحب صدر نے نمائندوں سے خواہش کی کہ سب سے پہلے وہ اپنا تعارف کرا دیں۔ چنانچہ نمائندوں نے سلسلہ وار اپنا تعارف کرایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر علیم نے کہا کہ ہماری دو روزہ اُردو کانفرنس ختم ہوگئی ——— اب ہمیں اپنے کام کا جائزہ لینا ہے تاکہ اس کی روشنی میں ہم آئندہ اس سے وسیع اور منظم طریقہ پر کام کر سکیں۔ کانفرنس پر جو صاحب اظہار خیال فرمانا چاہیں وہ ڈائس پر تشریف لے آئیں۔ نمائندوں کے اظہار خیال سے پہلے سردار جعفری (بمبئی) نے اپنی مشکلات، وقت کی تنگی، رضاکاروں کی عدم فراہمی سرمایہ کی کمی، انجمن کی شاخوں کی عدم اطلاع اور دوسری تفصیلات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے نہایت جرأت کے ساتھ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کیا۔ اور مندوبین کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے تنظیمی خرابیوں کے باوجود کانفرنس میں حصہ لے کر اسے کامیاب بنایا۔

سلطانہ بیگم (بمبئی) نے کہا کہ ہمارے مقالہ نگار سننے والوں کی دلچسپی کا بہت کم لحاظ رکھتے ہیں۔ اس کانفرنس میں کافی طویل مقالے پڑھے گئے مقالہ نگاروں کو چاہئے کہ وہ مختصر نویسی سے کام لیں۔ میں نے خاص طور پر کانفرنس کے مشاعرہ کی بدنظمی اور شعراء کی بے ترتیبی پر اپنے تاثرات پیش کئے اور سلام مچھلی شہری اور علی جواد زیدی وغیرہ کی عدم شرکت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ مقامی طور پر ذاتی اختلافات اور رنجشیں ختم ہو جانا چاہئے۔ اگر ہم ٹھوس بنیادوں اور یکجہتی کے ساتھ اپنے کام کو وسعت دینا چاہتے ہیں۔ میں نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کانفرنس کا میٹر یا تو کتابی صورت میں یا نیا ادب یا نگار میں شائع کیا جائے تاکہ کانفرنس کو تاریخی حیثیت حاصل ہو سکے۔ پہلی کانفرنس کا مواد مجموعی طور پر ہمارے سامنے نہیں آسکا ——— ہمیں اپنی رفتار ترقی کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے۔

کوکب جمیل (بدایوں) نے تجویز پیش کی کہ ہمارے تمام ترقی پسند رسائل کو ایک پالیسی اور معیار کے تحت شائع ہونا چاہئے اور ہمیں ایک حلقہ بنا کر کام کرنا چاہیئے عمران الارشد (بھوپال) نے کہا کہ ابھی تک ہماری انجمن نے پروپگنڈہ پر زیادہ توجہ نہیں کی ہے۔ ہمیں نہ صرف انجمن کے مقاصد کو عام کرنے کی ضرورت ہے بلکہ شاخوں کو بھی منظم کرنا چاہئے اور ایک کو دوسرے سے باخبر رکھنا چاہئے۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہماری ادبی تحریک کی کارروائیاں باضابطہ شائع ہوتی رہیں۔ عبادت بریلوی (لکھنؤ) نے کہا کہ عموماً ہم مقالوں اور سنجیدہ چیزوں میں کم دلچسپی لیتے ہیں، یہ کام ہمیں تقسیم کر لینا چاہئے تاکہ اُردو ادب کی ٹھوس خدمت کی جا سکے۔ فراق گورکھپوری (الٰہ آباد) نے تجویز پیش کی کہ ہمیں ادب کی ایک ایسی تاریخ مرتب کر دینا چاہیئے جس سے آج کا طالب علم ادب کے ارتقاء کا ایک نظر اندازہ لگا سکے۔ یہ کام ترقی پسندوں کو جلد از جلد کرنا چاہئے۔ ممتاز حسین (بمبئی) نے کہا کہ کل ہند کانفرنس کی زبانی نہیں بلکہ تحریری رپورٹ پیش کی جانا چاہئے۔ فرحت کانپوری (کانپور) نے تنظیم اور تعمیری کاموں پر زور دیا اور مستقل کمیٹیوں کے ذریعہ کام کرنے کی تجویز پیش کی۔

سردار جعفری (بمبئی) نے میرے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے اس کا اعادہ کیا کہ دراصل سلام مچھلی شہری کو اس بات کی شکایت پیدا ہوگئی تھی کہ کانفرنس کا جو پوسٹر شائع ہوا اس میں اُن کا نام کیوں نہیں دیا گیا۔ اسی طرح علی جواد زیدی کو یہ شکایت رہی کہ کانفرنس کی جو کمیٹی بنائی گئی اس میں اُن کا نام کیوں نہیں رکھا گیا۔ سلام سے انھوں نے ملکر معذرت کی تھی اور اپنی عدم موجودگی میں پوسٹر کی اشاعت کا اظہار کیا تھا۔ پھر بھی وہ شریک نہیں ہوئے۔ علی جواد زیدی چونکہ گورنمنٹ ملازم تھے اس لئے اُن کا نام کمیٹی میں نہیں رکھا جا سکا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہمیں افسوس ہے کہ ان حضرات نے باوجود کوشش ہم سے تعاون نہیں کیا۔

سجاد ظہیر (بمبئی) نے نمائندوں کی تجاویز اور مشوروں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ ہم نے کافی ترقی کر لی ہے۔ اب ہمیں شاخوں کی باضابطہ تنظیم کرنا ہے۔ آئندہ شاخیں مرکز سے پوری طرح ہم آہنگ رہ کر کام کریں گی۔ ہر شاخ کو چاہئے کہ وہ اپنی ماہانہ رپورٹ جنرل سکریٹری کو بھیجا کرے۔ آئندہ ہمیں سہ ماہی کانفرنسیں کرنی ہونگی تاکہ ہم وسیع پیمانہ پر اپنی انجمن کے مقاصد کو عام کر سکیں۔ ہمیں مشاعروں کو بھی صحیح طور پر اور جدید تقاضوں کے مطابق ترتیب دینا ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ ہم تو یہ بھی چاہتے ہیں کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک وسیع عمارت بھی تعمیر ہو جائے جس میں اُردو اور ہندی پر علٰحدہ علٰحدہ کام کیا جا سکے۔ کانفرنس پر اظہار رائے کرتے ہوئے انھوں نے اعتراف کیا کہ زبان کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہ اجلاس سب سے آخر میں ہوا اور

اس موضوع پر بحث و تمحیص کے لئے زیادہ وقت نہیں مل سکا۔ بہر حال اس تجربہ سے ہم آئندہ زیادہ تنظیمی صلاحیتوں سے کام لے سکیں گے۔ کانفرنس کے ٹکٹوں سے تقریباً ۵۰۰ آمدنی ــــ ہوئی ہے مگر ہمیں فنڈ کی مزید ضرورت ہے تاکہ ہم منظم طریقہ پر کام کو آگے بڑھا سکیں "نیا ادب" بھی سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے بند ہے اُسے بھی ہم جاری کرنا چاہتے ہیں جس کے لئے شاخوں کو ہماری مدد کرنا چاہیئے۔ انھوں نے کانفرنس نمبر کی اشاعت کے خیال کو پسند کیا اور کہا کہ ہمیں افکار اور دوسرے رسائل کی قلمی اعانت کرنی چاہیئے تاکہ وہ ترقی کر سکیں۔ "نیا ادب" کے لئے سرمایہ فراہم ہونا ضروری ہے۔ اس لئے شاخوں کے جو نمائندے یہاں موجود ہیں وہ کم سے کم ۵۰ روپے مرکزی انجمن کو چندہ دیں۔ نیا ادب کا کانفرنس نمبر سرمایہ کی فراہمی کے بعد مارچ میں شائع کیا جائیگا۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ آئندہ کانفرنس میں وہ جنرل سکریٹری کے عہدہ سے سبکدوش ہو جائیں گے کیونکہ پارٹی کے دوسرے کاموں کی زیادتی کی وجہ سے وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے لئے زیادہ وقت نہیں نکال سکے اور یہی وجہ ہے کہ انجمن کی تنظیم میں خرابیاں رہیں۔ متفقہ طور پر سردار جعفری ناظم شعبۂ اردو منتخب کئے گئے۔ اور طے کیا گیا کہ اُن کا صدر دفتر بمبئی میں رہے۔ میٹنگ ختم ہونے سے پہلے ڈاکٹر علیم نے تمام نمائندوں کا پھر شکریہ ادا کیا تقریباً ۱ بجے یہ میٹنگ ختم ہوئی۔ مجلس استقبالیہ نے تمام نمائندوں کو ۹ بجے شب میں کافی ہاؤس میں دعوت دی۔ ڈاکٹر رشید جہاں نے جو عام طور پر "رشید آپا" کہلاتی ہیں صرف بھوپال اور حیدرآباد کے مندوبین کو یکم جنوری ۴۷ء کی رات میں کافی کی دعوت دی۔

گورنمنٹ ہاؤس میں عصرانہ

اسی روز شام کو ۴ بجے شریمتی سروجنی نائیڈو گورنر یو۔پی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے نمائندوں کو عصرانہ پر مدعو کیا۔ قاضی عبد الغفار، نیاز فتحپوری، اثر، جگر، اختر انصاری، اقبال، سہیل، فراق، وامق، جذبی، مجاز، سردار جعفری، احتشام حسین، آل احمد سرور، علی عباس حسینی، روش، سلیمان اریب، مسعود اختر جمال، اختر حسین تحسین سروری، شاہد صدیقی، مسعود علی ذوقی، سلطانہ بیگم، ریاست قائم علی، رضیہ بیگم وغیرہ ٹھیک وقت پر گورنمنٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ جن کا شریمتی نے پرتپاک خیر مقدم کیا۔ میں نے انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال کی جانب سے انجمن کی تصنیف "خونی ہے ہندستان" سروجنی نائیڈو کی خدمت میں پیش کی جسے انھوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ اور کلب کے مقصد اور بھوپال کے ترقی پسندوں کے متعلق گفتگو کرتی رہیں۔ ترقی پسند مصنفین کا عصرانہ خصوصی اہتمام کا حامل تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس کا ماحول، شریمتی سروجنی نائیڈو کا ہنس ہنس کر باتیں کرنا اور ہر ایک فنکار کو کچھ نہ کچھ کھانے کے لئے اپنے ہاتھ سے دینا ــــ ایک ایسی فضا پیدا کر رہا تھا کہ ہر ساتھی "اقتدار" اور "حکومت" جیسے ثقیل الفاظ کو بھولنے پر مجبور تھا، سادگی اور پُرکاری اس اجتماع کے ناقابل فراموش نفسیاتی اثرات تھے جنھیں تقریباً سب نے محسوس کیا۔ چاء کے بعد شریمتی نے فرمایا کہ جاؤ تم سب باغ میں گھوم آؤ ــــ یہ وہی گورنمنٹ ہاؤس ہے جہاں اس سے پہلے بہت کچھ تھا مگر اب ــــ کچھ ساتھی باغ میں ٹہلنے کے لئے چلے گئے۔ کچھ وہیں برآمدے میں سگرٹ اور پان سے شغل کرنے لگے۔ حتّٰی کہ مغرب ہوگئی۔ مغرب کے بعد گورنمنٹ ہاؤس کے ہال میں ہم سب پھر جمع ہوئے۔ اس اجتماع کا مقصد مشاعرہ تھا۔ شریمتی کی زیر صدارت گورنمنٹ ہاؤس کی خاموش اور پُرسکون فضاؤں میں مشاعرہ شروع ہوا۔ ایک طرف ترقی پسند فنکار بیٹھے تھے اور دوسری طرف لکھنؤ کے معززین اور اُن کی خواتین، کچھ پردہ میں اور زیادہ بے پردہ جلوہ فرما تھیں ــــ آل احمد سرور اس مشاعرہ کے سکریٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ ترقی پسند شعراء کے کلام کو صدر اور حاضرین نے بڑی دلچسپی اور توجہ سے سنا اور صحیح داد دی۔

آخر میں شریمتی سے استدعا کی گئی کہ وہ اپنے کلام سے مستفیض فرمائیں۔ وہ اپنا مجموعہ لینے کے لئے اندر تشریف لے گئیں کہ اس عرصہ میں اُن کے ایک "معزز مہمان" تشریف لے آئے جس کی وجہ سے وہ اپنا کلام نہیں سنا سکیں۔ مشاعرہ تقریباً ۸½ بجے شب کو اس اجتماع کے ــــ تاریخی نقوش چھوڑ کر ختم ہوا۔

کافی ہاؤس

۹ بجے شب کو مجلس استقبالیہ کی جانب سے کافی ہاؤس میں تمام نمائندوں کی پر تکلف کافی سے تواضع کی گئی۔ دلچسپ صحبت

تقریباً ۱½ گھنٹہ جاری رہی۔

الوداعی اجتماع

یکم جنوری ۴۸ء کو رشید آپا کے بنگلہ پر بھوپال اور حیدرآباد کے نمائندوں کے علاوہ سردار جعفری، سلطانہ بیگم، شورش، کامریڈ نعیم، آل احمد سرور، جذبی وغیرہ بھی ۹ بجے کے قریب پہونچ گئے —— آپا نے بلایا تو کافی پر تھا۔ مگر پوریوں اور کباب وغیرہ نے کھانے کی فضا پیدا کردی —— سلطانہ بیگم بھوکی تھیں اس لئے بہت بے تکلفی سے کھانے میں مصروف ہوگئیں —— دوسرے ساتھی کھانا کھا چکے تھے اس لئے انھوں نے "مختصرات" سے کام لیا۔ اسی دوران میں دلچسپ ادبی، سیاسی، ذاتی اور بھوپال اور حیدرآباد کی پُرلطف گفتگو کا سلسلہ جاری رہا، اور تقریباً ۱۲ بجے سب ساتھی ایک دوسرے سے جدا ہوئے، اس طرح کانفرنس کی تفصیلی اور ذیلی کارروائیاں بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوئیں۔

صہباء

[illegible]